ادب اور سیاسی شعور: انوار احمد کی نثر میں پاکستانی سیاسی منظر نامے کی پیشکش کا مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔ فل (اردو)

مقالہ نگار:

عطیہ رحیم

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جولائی ۲۰۲۱ء

ادب اور سیاسی شعور: انوار احمد کی نثر میں پاکستانی سیاسی منظر نامے کی پیشکش کا مطالعہ

مقالہ نگار:

عطیہ رحیم

یہ مقالہ

ایم فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگو یجز

(اردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

جولائی ۲۰۲۱ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے۔ وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگوئجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **ادب اور سیاسی شعور: انوار احمد کی نثر میں پاکستانی سیاسی منظر نامے کی پیشکش کا مطالعہ**

پیش کار: عطیہ رحیم رجسٹریشن نمبر: 1737/M/U/S19

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان و ادب

ڈاکٹر نعیم مظہر ____________________

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر شاہد صدیقی ____________________

ڈین فیکلٹی آف لینگوئجز

پروفیسر ڈاکٹر سفیر اعوان ____________________

پرو ریکٹر اکیڈ مکس

تاریخ ____________________

اقرار نامہ

میں عطیہ رحیم حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد کی ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر نعیم مظہر کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش کیا ہے اور نہ ہی آئندہ کروں گی۔

____

عطیہ رحیم

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

باب دوم: انوار احمد کی نثر میں مثبت سیاسی عناصر کا مطالعہ

باب سوم: انوار احمد کی نثر میں منفی سیاسی عناصر کا مطالعہ

باب چہارم: مجموعی جائزہ، تحقیقی نتائج، سفارشات

Abstract

Title:

Analytical study of political element in Anwar Ahmed prose

This research thesis is titled “Analytical study of political elements in Anwar Ahmed prose”.The purpose of this research is to analyze the political elements in Anwar Ahmed’ s fictional and nonfictional prose.Anwar Ahmed prose has been selected for this thesis.in which a book of sketches of Anwar Ahmed in which he has written sketches of different personalities and also his three books have been taken.how Anwar Ahmed has explained the positive and negative political elements and whether the nature of political elements in his sketches and fictions is different or same.

The political system of any country is influenced by its morals ,culture ,customs and attitudes.if we look at the political history of Pakistan ,the shadow of military dictatorship has been cast four times in the 70 year political history of Pakistan..there were some positive and some negative effects on the society that thrived under this oppressive and exploitative system.

The purpose of this research is explain the relationship between literature and politics,then analysis of the negative and positive political elements in Anwar Ahmed’s prose.And further the similarties and differences in Anwar Ahmed ‘s fictions and sketches.

There is a deep relation between literature and politics.it is natural for literature to be influenced by the national and revolutionary politics of its country.For the

research paper,I have adopted the documentary and historical method.

Also,accessed critical articles on Anwar Ahmed in contemporary literary journals and analysis and commentary on him. In the first chapter introduces the research title and explains the basic topics.The second chapter discusses the positive elements in Anwar Ahmed prose.In the third chapter,a study of negative political elements in Anwar Ahmed ,prose.

الحمداللہ رب العالمین۔

اول حمد و ثناء جس کی ذات واحد اور یکتا ہے جس کی کرم نوازی سے میں اس مقالے کی تکمیل تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کی مجھ پر مہربانی ہوئی کہ میں اپنا ایم فل اردو کا تحقیقی مقالہ مکمل کر سکی۔

اس مقالے کی تکمیل کے لیے میں اپنے نگران مقالہ ڈاکٹر نعیم مظہر اور شعبہ اردو کے باقی تمام اساتذہ کی شکر گزار ہوں جنہوں نے ابتداء سے اب تک ہر قدم پر میری رہنمائی کی، ہر مرحلے پر ان کی شفقت و خلوص میرے شامل حال رہا مجھے جس وقت بھی ان کی مدد کی ضرورت ہوئی تحقیق کے سلسلے میں مجھے جہاں بھی مشکل پیش آئی انہوں نے میری رہنمائی کی۔

آخر میں اپنے والد اور والدہ صاحبہ کی بے حد شکر گزار ہوں جنہوں نے ہر قدم پر میرا حوصلہ بڑھایا ساتھ ساتھ اپنے شوہر اور ساس سسر (ماموں ممانی) کا بے حد شکریہ جنہوں نے مجھے مقالہ لکھنے کا وقت دیا اور پر سکون ماحول میسر کیا۔ اس کے علاوہ دیگر احباب فائزہ مظہر علوی، ذکاوت عباسی، علی رضا شاہ، کا بھی شکریہ جنہوں نے جہاں بھی مشکل پیش آئی انہوں نے میری مدد کی۔

عطیہ رحیم

سکالر ایم۔ فل اردو

باب اول:

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

ا۔ موضوع کا تعارف

کسی بھی ملک کے سیاسی نظام پر وہاں کی اخلاقیات ،تہذیب،رسم ورواج اور اندازِ فکر و عمل اثر انداز ہوتے ہیں۔پاکستان کی سیاسی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو پاکستان کی ستر سالہ سیاسی تاریخ میں چار بار عسکری آمریت کے سائے منڈلائے۔ اس جابرانہ اور استحصال زدہ نظام کے تحت فروغ پانے والے معاشرے میں کچھ مثبت اور کچھ منفی اثرات مرتب ہوئے جن میں امید ،انصاف پسندی ،ترقی پسندی ،مزاحمت،احتجاج،سیاسی جبر وتشدد، عدم شناخت ، ،لاقانونیت،غلامی، آزادی اظہار کی پابندی، سماجی و معاشی استحصال،انتشار اور دیگر عناصر نے تیزی سے فروغ پایا۔ اردو ادب کے مختلف ادیبوں نے ان موضوعات کو اپنی نثر اور شاعری میں اس طرح سمویا ہے کہ وہ جابرانہ حکومت کی زد میں نہ آسکیں ۔ آزادی اور مساوات کے حق میں اور مارشل لاء کے جبر وستم کے خلاف لکھا جانے والا ادب دراصل ایک رد عمل ہے جس کا عوام تو اظہار نہ کر سکے لیکن ادیبوں نے اس کی نمائندگی اپنے ادب کے ذریعے کی۔ انوار احمد کا شمار بھی ان ادیبوں میں ہوتا جنھوں نے سیاسی عناصر کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔ سیاست و آمریت کے ادوار نے ادب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پہلے مارشل لاء نے معاشرتی تضادات، معاشی ناآسودگی اور اخلاقی قدروں کی ٹوٹ پھوٹ کا گہرا احساس پیدا کیا۔ اس دور کے دیگر ادیبوں کے ساتھ ساتھ انوار احمد کی تحریروں میں بھی تلخی اور بے زاری دیکھی جا سکتی ہے آمریت کے دور میں آزادی اظہار پر پابندی اور سزاؤں کے اثرات ادب پر مرتب ہوئے۔ سیاسی حالات کے نتیجے میں معاشی بدحالی،نفسیاتی کشمکش اور معاشرتی انتشار جیسے مسائل نے جنم لیا۔اس دور میں ادیبوں نے علامتی، استعاراتی اور تمثیلی اسلوب اپنایا۔ سیاست اور آمریت کے بدترین دور میں انوار احمد کا نام بھی قابل ذکر ہے جن کی تحریریں سیاسی جبر کی صورتحال کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔

۲۔ بیان مسئلہ:

سیاست اور آمریت کے دور میں ادیبوں نے مختلف نقطہ نظر کے تحت سیاسی جبر و تشدد اور ملکی سیاسی صورتحال کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔ پاکستانی ادیبوں نے سیاسی صورتحال کے حوالے سے جس ردعمل کا اظہار شعوری اور لاشعوری طور پر کیا سیاسی جبر کی کیفیت نے جس طرح سماجی صورت حال اور انسانی رشتوں کو متاثر کیا وہ سب انوار احمد کی تحریروں میں واضح طور پر دیکھائی دیتا ہے۔ اس لیے ضروری یہ ہے کہ سیاسی نظام کے حوالے سے انوار احمد کی افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں جو سیاسی عناصر ملتے ہیں ان کو دیکھا جائے کہ ان کے ہاں ملکی سیاسی صورتحال اور جبر و تشدد کی نوعیت کیا ہے۔

۳۔ مقاصد تحقیق:

۱۔ ادب اور سیاست کے تعلق کو واضح کرنا۔

۲۔ انوار احمد کی نثر میں موجود منفی اور مثبت سیاسی عناصر کا تجزیہ کرنا۔

۳۔ انوار احمد کے افسانوں اور خاکوں میں موجود مماثل اور غیر مماثل سیاسی عناصر کو سامنے لانا۔

۴۔ تحقیقی سوالات:

۱۔ انوار احمد کے عہد کا سیاسی منظر نامہ کیا ہے؟

۲۔ انوار احمد کی نثر میں مثبت اور منفی سیاسی عناصر کون کون سے ہیں؟

۳۔ انوار احمد کے خاکوں اور افسانوں میں سیاسی عناصر کے حوالے سے اشتراکات و افتراقات کیا ہیں؟

۵۔ نظری دائرہ کار:

ادب اور سیاست کا گہرا تعلق ہے۔ موجودہ زمانے میں سیاست ادب سے الگ نہیں ہو سکتی۔ ادب کا اپنے ملک کی قومی اور انقلابی سیاست سے متاثر ہونا ایک فطری عمل ہے۔ ایک ادیب سیاسی واقعات سے زیادہ سیاسی واقعات کے انسانی زندگی پر پڑنے والے اثرات کو اہمیت دیتا ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی "ادب میں سیاست کی بھی اتنی ہی گنجائش ہے جتنی فلسفے یا مذہب یا اخلاق کی۔ مگر ادب کا طریقہ کار، سوال کرنے، سوالیہ نشان بنانے مسئلے پیش کرنے سے سروکار رکھتا ہے جواب یا حل سے کم اور سیاست یا فلسفے یا مذہب کو حل کی فکر ہوتی ہے۔" بقول احمد ندیم قاسمی "جو ادیب سیاست کا تمسخر اڑاتے ہیں وہ دراصل ایک قسم کی سیاست کا مظاہرہ کر رہے ہوتے ہیں اور سیاست بازی پر لعن طعن کرتے ہیں تو درحقیقت وہ اس سیاست کا شعوری یا غیر شعوری آلہ کار ہوتا ہے۔" مجوزہ تحقیقی کام میں اس بات کو مدِ نظر رکھا جائے گا کہ رونما ہونے والے اہم سیاسی واقعات نے انوار احمد کی تخلیقیت اور حساسیت کو کس سطح تک متاثر کیا۔

۶۔ تحقیقی طریقہ کار:

تحقیقی مقالے کے لیے میں نے دستاویزی اور تاریخی طریقہ اختیار کیا ہے۔ معاصر ادبی جریدوں میں انوار احمد پر شائع ہونے والے تنقیدی مضامین اور ان پر کیے جانے والے تجزیوں اور تبصروں تک بھی رسائی کو ممکن بنایا۔ اس کے علاوہ مختلف کتب خانوں میں انوار احمد کے حوالے سے لکھی جانے والی تنقیدی کتب سے بھی رہنمائی لی اور مقالے میں مستند حوالے پیش کیے۔

۷۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق:

اردو ادب میں جامعاتی سطح پر انوار احمد کی نثر میں سیاسی عناصر کے حوالے سے کوئی سندی کام نہیں ہوا البتہ مختلف مضامین کی صورت میں انوار احمد کی افسانوی نثر کے حوالے سے تنقیدی کام موجود ہے اس حوالے سے "طاہرہ اقبال کا

مضمون ''انوار احمد کی افسانوی جہات'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے لہٰذا انوار احمد کی افسانوی اور غیر افسانوی نثر پر سیاسی عناصر کے حوالے سے میرا کام اردو ادب میں وسعت کا باعث بنے گا۔ اس لیے اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ ایک نیا موضوع ہے۔

۸۔ تحدید:

اردو ادب میں سیاسی آمریت اور جبر واستحصال کے خلاف لکھنے والوں کا دائرہ نثر اور شاعری دونوں میں پھیلا ہوا ہے اس لیے ہر ادیب کی تحریروں میں موجود سیاسی عناصر کو سمیٹنا مشکل ہے۔ اس لیے مقالے کی تحدید کے لیے انوار احمد کی تحریروں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ جس میں انوار احمد کی افسانوی اور غیر افسانوی نثر کو سیاسی عناصر کے تناظر میں پرکھا۔

۹۔ پس منظری مطالعہ:

انوار احمد کی نثر میں سیاسی عناصر کی تفہیم کے لیے ڈاکٹر جمیل جالبی ''معاصر ادب (فکری و تنقیدی مضامین کا مجموعہ) اور احمد ندیم قاسمی ''تہذیب و فن'' تنقیدی کتب کا مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ انوار احمد کے تین افسانوی مجموعے ''پہلی سے سنی ہوئی کہانی'' ''ایک ہی کہانی'' ''آخری خط'' اور خاکے ''یادگارِ زمانہ ہیں جو لوگ'' میں موجود سیاسی عناصر کی نشان دہی کی۔ اور انوار احمد کی نثر پر لکھے گئے تنقیدی مضامین ''ادب اور سیاست راجندر سنگھ بیدی'' ادب اور احتجاج محمد سلیم'' اور سیاست ، ادیب اور آزادی ممتاز شیریں کو مدنظر رکھا ہے۔

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت:

پاکستان میں سیاسی جبر و تشدد کا آغاز ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء سے ہی ہو گیا تھا۔ سیاسی جبر واستحصال ہر دور میں کسی نہ کسی طرح جاری رہا۔ قیام پاکستان کے بعد اپنے ہی سیاسی حکمرانوں اور سیاسی آمریت کی بنا پر ہونے والے جبر و تشدد کی نوعیت ہی الگ تھی۔ ان ادوار میں ادیبوں نے ملکی سیاسی صورتحال کو موضوع بنا کر اپنی تحریروں میں شامل کیا جس سے یہ اندازہ ہوا کہ ان کی تحریروں میں سیاست اور ادب کا کیا ربط ہے۔

ب۔ ادب اور سیاست کا تعلق

ادب عربی زبان کا لفظ ہے۔انگریزی میں اس کے لئے ''لٹریچر'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔جب کہ ادب کے معنی سلیقہ،شائستگی اور حسن سلوک وغیرہ کے ہیں۔ادب زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔کسی بھی ملک کا ادب اس کے ماحول،مذہب،تہذیب و تمدن،معاشرت ،عوامی آرزؤں اور اجتماعی خوابوں کا ترجمان ہوتا ہے ۔قیام پاکستان کے بعد لکھے جانے والے نثری اور شعری ادب کو ہم پاکستانی ادب کا نام دے سکتے ہیں۔ہر ادیب نے اپنے اپنے انداز میں ادب کی تعریف کرنے کی کوشش کی ہے۔پاکستانی دور کے ادب کے شعری اور نثری ادب کے نمایاں موضوعات میں ہجرت کا غم،فسادات کا المیہ ،آمرانہ نظام اور غیر مستحکم سیاسی نظام وغیرہ شامل ہیں ۔انسانوں میں ادب و احترام کا شعور روز اول سے ہے۔ادب تہذیب کی ایک بنیاد ہے لیکن ہر زبان میں ادب کا ایک الگ معنی لیا جاتا ہے۔میتھو آرنلڈ کے نزدیک ''وہ تمام علم جو کتابوں کے ذریعے ہم تک پہنچتا ہے ادب کہلاتا ہے۔'' (۱)

نیومین کے قول کے مطابق ''وہ تمام افکار اور احساسات جو زبان اور لفظ کے ذریعے اداہوں وہ ادب کہلاتے ہیں ۔'' (۲) ادب کو تعلیم کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے ۔اور ایسی تمام معلومات جو ہمیں کتابوں کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں ادب کے زمرے میں آتی ہیں۔ ادب جذبہ اور علم کی درمیانی خلیج کو بانٹنے اور انسان کو ایک داخلی ممانیت عطا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ادب انسانی خیالات ،جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ادب تنقیدِ حیات ہے کامیاب ادب وہ ہوتا ہے جو حال اور مستقبل دونوں کی نمائندگی کرے اگر پاکستانی ادب کے متعلق بات کریں۔

> ''پاکستانی ادب وہ ہے جس میں پاکستانی روایات،حالات،پس منظر اور پیش منظر سے مطابقت موجود ہو۔اس میں مقامیت کے مقاصد کے ساتھ آفاقیت بھی موجودہ ہے۔'' (۳)

ادب زندگی کی تسخیر کا پہلا قدم ہے لیکن افسوس اس بات کا کہ لوگ اسے ابھی تک پہلا قدم ہی نہ سمجھ سکے اگر پاکستانی ادب کی بات کریں تو اس سے مراد وہ ادب ہے جس میں پاکستانی ثقافت،تہذیب و تمدن پاکستانی روایات اور معاشرے سے مطابقت رکھتا ہو کیونکہ کسی بھی ملک کا ادب اس ملک کے مذہب،ماحول،تہذیب و تمدن عوامی خواہشات اور

اجتماعی خوابوں کی نمائندگی کرتا ہے پاکستان کے قیام کے بعد جو بھی نثری اور شعری ادب تخلیق کیا گیا وہ پاکستانی ادب کے زمرے میں ہی آتا ہے اور وہ ادب جو پاکستان میں رہنے والے ادیبوں نے تحریر کیا وہ پاکستانی ادب ہے پاکستانی ادب کی اپنی الگ سے ایک پہچان ہے۔

"پاکستانی ادب سے مراد وہ ادب جو پاکستان کے وجود، پاکستان کے وقار اور پاکستان کے طریقے کا اس اثبات کرتا ہو اور جو پاکستان کے تہذیبی و تاریخی مظاہر کا ترجمان ہو اور جو یہاں کے کروڑوں باشندوں کی امنگوں اور آرزوؤں نیز شکستوں اور محرومیوں کا غیر جانبدار عکاس ہو۔" (۴)

کسی بھی ملک کے ادب میں اس ملک کی پہچان اور اس کی ثقافت واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے ہمارا ادب وہ ہی جس میں ہماری زبان، تہذیب اور فکر کی شناخت ہو۔ جن دنوں برصغیر کے مسلمان ایک الگ وطن کے قیام کا خواب دیکھ رہے تھے تو یہاں کا ترقی پسند ادیب اپنے ہی انداز سے سوچ رہا تھا برصغیر کی تقسیم سے پہلے اردو ادب ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ تہذیب کا نمائندہ تھا مگر قیام پاکستان کے بعد اس کا رشتہ پاکستان کی زمین کے ساتھ جڑ گیا۔ ادب انسان کے باطن میں موجزن احساس سے جڑ ا رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سب کچھ نیا ہو گیا تھا نیا افسانہ، نئی غزل اور نئی نظم کا آغاز ہو تھا۔

فرہنگ تلفظ کے مطابق سیاست "سیاست عربی زبان کا لفظ ہے۔ سیاست کے معنی حکمت عملی، مصلحت اندیشی، حکمرانی، ملکی امور، حصول اقتدار اور مفادات کے تحفظ کے لیے جدوجہد کا نام ہے۔" (۵) سیاست باہمی رابطوں کا ایک پھیلا ہوا پیچیدہ نظام ہے سیاست وہ راہ ہے جس پر چل کر اپنے ملک و قوم کی خدمت کی جا سکتی ہے مسلمانوں کے اندر سیاسی شعور بیدار کرنا انہیں اس میدان میں اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے آمادہ کرنا ہے ہر ادیب سیاست سے جڑا ہوا ہوتا ہے سیاست سے ادب میں روشن خیالی اور ترقی پسندی کا دور آیا۔ ادیب چاہے جو بھی ہو سیاست سے الگ نہیں رہ سکتا ہے کیونکہ ہمارا سیاسی مستقبل ہی ادب کے لیے راہ ہموار کرتا ہے۔ اردو ادب شروع ہی سے سیاسی حالات کے زیر اثر مختلف وسیلوں اور مقامات سے پروان چڑھا ہے۔

"سیاست سے مراد حکومت کاری کا علم، کسی حکومت قوم یا کسی مملکت کی حکمت عملی اور مقاصد، سیاسی جماعتوں کے طور طریقے اور ان کے مقابلے، سیاسی معاملات، کسی شخص کے سیاسی روابط یا عقائد، ان لوگوں کی ریشہ دوانیاں یا منصوبہ بندیاں

جو ذاتی طاقت، شان و شوکت، منصب یا اسی قسم کے دیگر مقاصد کے خواہاں ہوں۔" (۶)

سیاست حکومتی معمولات کو جاننے اور سمجھنے کا نام ہے کسی بھی ملک یا حکومت کی حکمت عملی اور اس کے مقاصد کو سمجھنا سیاست ہے سیاست وہ راستہ ہے جس پر چل کر ملک و قوم کی خدمت کی جاتی ہے ذرائع ابلاغ، تعلیمی اداروں، عدالتی نظام، ترقیاتی کام، خارجہ امور اور ملک کا نظم و نسق حکومت کی ذمہ داری ہے مسلمانوں کو سیاسی معمولات میں متحد ہونے کی ضرورت ہے مسلمانوں کا مقصد عدل وانصاف کا قیام اور مظلوموں کی مدد ہونا چاہیے۔ جامع علمی اردو لغت میں سیاست کے معنی "حفاظت، نگہبانی، انتظام، ملکی معاملات، ملک کی حفاظت، گناہوں کی سزا، خوف، دہشت، دھمکی، مار پیٹ، باز پرس۔" (۷) سیاست دراصل اس پالیسی کا نام ہے جس میں کوئی بھی گروہ اپنے مقصد کی بالادستی کو یقینی بناتا ہے۔ سیاست کی بہت سی اقسام ہو سکتی ہیں جن میں حقوق کے حصول، اقتدار کے حصول، ذاتی مفادات کا تحفظ، جمہوری روایات کا تحفظ اور مذہبی اقدار کا تحفظ وغیرہ شامل ہے۔ عربی میں سیاست کا مطلب ملکی تدبیر و انتظام وغیرہ۔ سیاست کا لفظ بعض اوقات حکمت و دانائی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یونان میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہوتی تھیں جنہیں "polis" کہا جاتا تھا۔ انگریزی میں سیاست کے لیے "politics" کا لفظ مستعمل ہے۔ سیاست ریاست اور حکومت کے مابین تعلق کا نام ہے۔ سیاست کا آغاز قدیم یونانی شہری ریاستوں سے ہوا چنانچہ انگریزی لفظ "politics" یونانی زبان کے لفظ "polis" سے ماخوذ ہے جس کے معنی شہری ریاست یا شہر کے ہیں۔ یونانی شہر سے مراد ریاست لیتے تھے کیونکہ زمانہ قدیم میں یونان چھوٹی چھوٹی آبادیوں میں تقسیم تھا جن کو اکثر شہری ریاستوں سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ ان ریاستوں کے افراد کے ہاں سیاسی یونانیوں کے نزدیک سیاست کا تعلق ہر اس امر سے ہے جو ریاست سے وابستہ ہو یعنی جو علم ریاست سے متعلق ہوتا تھا اس کو سیاست کا نام دیا جاتا تھا۔ لیکن جدید دور میں سیاست کا لفظ بالکل مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جدید دور میں سیاست سے مراد ایسا علم ہے جو ریاست اور حکومت کے سیاسی مسائل پر بحث کرے۔ فرہنگ آصفیہ کے مطابق " لفظ سیاست کے لغوی معنی ملک کی حفاظت و نگرانی، حکومت اور و سلطنت، ملک کا انتظام، بندوبست اور نظم و نسق کے ہیں۔" (۸)

" The word ‘politics’ is derived from polis ,meaning Literally ,city state,ancient Greek society was Divided into a collection of independent city-states,each of which possessed its own system of Government .” (۹)

ادب زندگی کا آئینہ دار ہے اور زندگی متنوع جہات کی حامل ہے۔زندگی کی یہ متنوع جہات ادب کو اپنی اپنی حیثیت سے متاثر کرتی رہتی ہیں۔ہر ادیب اپنے ارد گرد کے ماحول سے متاثر ہوتا ہے تو اس کا اظہار وہ اپنی تحریروں میں کرتا ہے۔تو اس لحاظ سے ادب اور سیاست کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ادب میں سیاست کا بیان زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ملک میں ہونے والے سیاسی واقعات ایک ادیب کو اس موضوع پر قلم اٹھانے کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔سیاسی واقعات اور معاملات کی جھلک ادب کو جہاں عصری شعور عطا کرتی ہے وہیں اپنے عہد کی عکاس بھی بن جاتی ہے۔اگر ہم ادبی تاریخ پر غور کریں تو بہت سے ایسے سیاسی واقعات رونما ہوئے ہیں جو کسی عہد یا ادیب کی نمایاں پہچان بن کر سامنے آئے ہیں۔زمانہ قدیم میں اگر ادب اور سیاست کے تعلق پر غور کریں تو میر تقی میر کے ہاں بھی ادب اور سیاست کا تعلق واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ان کے ہاتھ دلی کے لیے دل کے استعارے اس عہد کی سیاسی ابتری اور ہلچل کی تغزل کے رنگ سیاسی صورتحال کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

ایک ادیب بعض اوقات تو شعوری طور پر ملکی سیاسی صورتحال کو اپنی تحریروں کا حصہ بناتا ہے لیکن بعض اوقات لاشعوری طور پر بھی ملکی سیاسی صورتحال ایک ادیب کی تحریروں میں جھلکتی ہے۔اس طرح ادب اور سیاست کا تعلق نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے۔اگر ادب پر اقدار کے حوالے سے غور و فکر کیا جائے تو تب بھی سیاست ایک اہم قدر کے طور پر ادب میں نظر آتی ہے۔لیکن ادب کا براہ راست زندگی سے تعلق ہونے کی وجہ سے سیاست اور ادب کا گہرا رشتہ بنتا ہے اگرچہ مذہب ،اخلاق،فلسفہ،جمالیات اور ثقافت بھی اہم ہیں۔

ادب زندگی کا عکاس ہے اور زندگی کی تمام اقدار کی عکاسی کرنا ادب کا فرض ہے۔چنانچہ ادب دیگر جہات اور اقدار کی طرح سیاست کو بھی بھرپور انداز میں بیان کرتا ہے۔ادب میں سیاست کا بیان ہر دور میں کسی نہ کسی

طرح سے جاری رہا چاہے غزل ہو یا نظم، افسانہ ہو یا ناول سب میں سیاست کا بیان جاری و ساری رہا۔ ادب اور سیاست کے آپس کے گہرے تعلق کی وجہ سے بڑی بڑی ادبی تحریکیں اور نظریات جڑے ہوئے ہیں۔

"ادب میں سیاست کی بھی اتنی ہی گنجائش ہے جتنی فلسفے یا مذہب کی مگر ادب کا طریقہ، سوال کرنے، سوالیہ نشان بنانے، مسئلے پیش کرنے سے زیادہ ہے جواب یا حل سے کم اور سیاست یا فلسفے یا مذہب کو حل کی فکر ہوتی ہے۔" (۱۰)

سوویٹ ادب، مارکسی نظریات، ترقی پسند تحریک، کمیونزم اور سوشلزم کا فروغ یہ سب ایسے زاویے ہیں جن کو ادب میں بڑے احسن انداز میں بیان کیا۔ اس طرح ادب اظہار اور انقلاب کی ایک ایسی قوت بن کر سامنے آیا ہے جس میں زندگی کے ہر شعبے اور بالخصوص سیاست کی نمایاں جھلک ملتی ہے۔

"ادب نام ہے زندگی کی عکاسی کا اور جب یہ مسلمہ ہے کہ آزادی اور خاص خاص ضرورتوں کا مہیا ہونا ضروری ہے تو پھر یہ کہنا کیا کہ ادب میں سیاسی اُمور یا اشارہ نہ ہوں۔ سوچنا یہ ہے کہ کیا ادب بغیر ان باتوں کے ادب ہو بھی سکتا ہے؟ زندگی اقتصادیات سے وابستہ ہے اور اقتصادیات اور سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔" (۱۱)

ادب زندگی کی تمام سرگرمیوں میں سرِگرم عمل ہے۔ اگر ادب کو زندگی کی دیگر سرگرمیوں سے الگ رکھا جائے تو اس کی رفتار محدود ہو جائے گی۔ کیونکہ ادب زندگی کی ترجمانی کرتا ہے تو جس طرح سیاست زندگی کا حصہ ہے بالکل اسی طرح ادب سیاست سے الگ نہیں ہے۔ ادب اور سیاست کا گہرا رشتہ ہے ادب کو کسی بھی صورت میں سیاست سے الگ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ زندگی کا کوئی بھی ایسا پہلو موجود نہیں ہے جو سیاست سے جڑا ہوا نہ ہو۔ سیاست مذہب، اخلاق، فلسفہ سب میں موجود ہے۔ بعض لوگ ادب پر سیاست کے اثرات کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور بعض لوگ ادب اور سیاست کو لازم و ملزوم قرار دیتے ہیں۔

ادب کو سیاسی مقصد کے لئے صرف مقتدر طبقے نے ہی استعمال نہیں کیا بلکہ معروف نثر نگاروں اور شعراء حضرات نے بھی شعوری اور لاشعوری طور پر اپنے فن پاروں میں سیاسی صورتحال کا پردہ چاک کیا ہے۔

۔اصناف، شخصیات اور ادوار کے حوالے سے ادب میں سیاسی عناصر کا پایا جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ سیاست سماج اور زندگی کی ایک بڑی جہت ہونے کی وجہ سے ایک اہم موضوع رہی ہے۔اور سیاست ادب میں صرف سیاسی واقعات کے اظہار ہی سے محدود و مشروط نہیں بلکہ ادب اور سیاست کا رشتہ تو آزادی کا پرچار ہے۔معاشرہ ،فرد اور ادب اس وقت آزاد ہو سکتا ہے جب سیاسی صورتحال مثبت انداز میں اپنا کردار ادا کر رہی ہو۔

" سیاسی عمل کو ایک ایسی دنیا کی تعمیر کرنی چاہیے جس میں ادب آزادی کے ساتھ آزادی کی فضا میں اظہار کر سکے۔ ادب آزادی کے اظہار کی ایک حقیقی صورت ہے۔" (۱۲)

ادب اور سیاست کا تعلق صرف ایک دن کی بات نہیں ہے قیام پاکستان سے پہلے اور قیام پاکستان کے بعد بھی ادب میں سیاست کا شمول رہا ہے۔اور یہ سلسلہ ایسے ہی ہر دور میں چلتا رہے گا۔ادب اور سیاست کے رشتے کے حوالے سے ایک بات نہایت اہم ہے کہ ادب کو سیاست کا آلہ کار نہیں بننا چاہیے ادب اور سیاست کے تعلق کو عمدہ اسلوب میں ضرور بیان کریں مگر کسی مخصوص پہلو یا نقطہ نظر کا ہو کر نہ رہ جائیں۔ادب اور سیاست زندگی کی تمام سرگرمیوں کا احاطہ کرتا ہے۔سیاست زندگی کی ایک ایسی جہت ہے جو کم از کم ادب کے لئے بھرپور توانائی فراہم کرتی ہے۔کوئی بھی ادیب اپنے ماضی اور عہد کی سیاست اور سیاسی واقعات سے لاتعلق ہو کر فن کی بلندیوں کو چھو لینے والے فن پارے تخلیق نہیں کر سکتا۔جہاں ادب سیاسی آزادی کے لیے تڑپ پیدا کرتا ہے وہیں سیاسی واقعات کا رخ متعین کرنے میں بھی اپنا کردار ادا کرتا ہے۔کسی ادیب کو اس بات کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ کسی مخصوص پہلو پر لکھے ادب اور ادیب کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنا درست نہیں ہے۔ایک ادیب سیاست کو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے اور پھر اس کا اظہار ادبی اسلوب میں کرتا ہے۔ایک ادیب سیاست اور زندگی کے دیگر مسائل کو اپنے فن پاروں میں جگہ تو ضرور دیتا ہے مگر وہ خود کسی نظریے کا مقید ہو کر نہیں رہتا کیونکہ اس طرح سیاست تو چمکے گی مگر فن فنا ہو جائے گا۔

" ادب کا تعلق زندگی سے ہے سیاست زندگی کا صرف ایک جزو ہے۔زندگی کے ایک شعبے کی حیثیت سے ادب میں سیاست کا بھی گزر ضرور ہے۔یہاں ادب کو سیاسی نہ بنانے سے میرا

مطلب صرف یہ ہے کہ ادیب محض کسی آئیڈیالوجی کا آئینہ یا کسی سیاسی پارٹی کا آلہ کار بن کر
نہ رہ جائے۔ یہ بھی نہیں کے ادب کا سیاست سے کوئی واسطہ ہی نہیں" (۱۳)

ادب میں سیاسی واقعات کا بیان ضرور ہونا چاہیے اگرچہ اس موضوع پر دو آراء موجود ہیں ایک وہ طبقہ جو ادب اور سیاست کو بالکل الگ رکھتا ہے۔ ان کے نزدیک ادب اور سیاست کا کوئی ربط نہیں ہونا چاہیے۔ ان کا کہنا ہے کہ ادیب کو اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ لیکن ان میں ایک ایسا طبقہ بھی ہے جس کا خیال ہے کہ ادب اور سیاست کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔ ادب اور سیاست کو الگ کرنا بے وقوفی کے مترادف ہے۔ ادب اور سیاست کے تعلق کے حوالے سے بہت سی بحثیں ہیں جو ادب اور سیاست کے تعلق کو ہر زاویے سے پرکھتی ہیں۔ اس میں ادب اور جمہوریت کا تعلق بھی ہے گویا ادب اور سیاست کا تعلق پختہ ہے ادب زندگی کے تمام پہلوؤں کی نمائندگی کرتا ہے چاہے معاشرت ہو یا سیاست۔ جمہوریت اور ادب ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ایک دوسرے کو مستحکم کرتے ہیں۔ ادب بغیر سیاست کے ایک مرجھائے ہوئے پھولوں کی مانند ہے اور سیاست بغیر ادب کے ایک بنجر زمین کی مانند ہے۔ کسی بھی دور کا ادیب سیاست کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا وہ اس پر مجبور ہے کہ اپنے ادب میں سیاسی حقائق کے لئے جگہ پیدا کرے ایک ادیب یہ ضروری سمجھتا ہے کہ سیاست اور اس کے ادب کا باہمی تعلق محض اتفاقی نہ ہو بلکہ اس کی شعوری اور دانستہ کوشش کا نتیجہ ہو۔ سیاست ہمارے روزمرہ کا جز بن گئی ہے بلکہ ہماری زندگی کے سارے نظام پر اس کا تسلط ہے ایسی صورت میں کسی انسان کا اس سے انکار ممکن نہیں چنانچہ ادب پر سیاست کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔

ج۔ مثبت اور منفی سیاسی عناصر کی وضاحت

اردو ادب میں اگر سیاست اور ادب کے تعلق کے حوالے سے بات کریں تو ادب پر مختلف ادوار کے دوران کچھ مثبت اور کچھ منفی اثرات سامنے آئے ہیں۔ اگر مثبت سیاسی عناصر کو پیش نظر رکھا جائے تو اس میں امید، جذبہ آزادی، انصاف پسندی، ترقی پسندی، مزاحمت، احتجاج اور حب الوطنی جیسے عناصر شامل ہیں۔ لیکن اگر منفی سیاسی عناصر پر غور و فکر کیا جائے تو اس میں جبر و تشدد، بدعنوانی، ناانصافی، لاقانونیت اور آزادی اظہار کی پابندی وغیرہ شامل ہیں۔ سیاسی عناصر تقریباً ہر ادیب کی تحریروں میں کسی نہ کسی صورت میں نمایاں ہیں اور یہ

عناصر کبھی علامتی یا استعاراتی اور کبھی تمثیلی اسلوب میں دکھائی دیتے ہیں۔اور کہیں کہیں تو ادیبوں نے ان کا اظہار اپنی تحریروں میں واضح انداز میں کیا ہے۔سیاسی عناصر اور سیاسی واقعات کو تمام شعراء حضرات اور نثر نگاروں نے اپنی تحریروں میں شامل کیا ہے۔مثبت سیاسی عناصر کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو اس میں ایک عنصر مزاحمت بھی ہے۔مزاحمتی رویہ تقریباً تمام ادیبوں کے ہاں نظر آتا ہے چاہے وہ مارشلائی جبر و تشدد کے خلاف ہو یا ملکی سیاسی صورتحال کے خلاف ہو۔

مزاحمت عربی زبان کا لفظ ہے۔انگریزی میں اس کے لئے لیے "Resistance" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔مزاحمت دراصل ایک فلسفہ ہے جو کسی نظریے، نظام یا فکر کو قبول کرنے سے انکار پر مبنی ہوتا ہے۔مزاحمت ان آزاد سماجی و ثقافتی رویوں کے جبر و استحصال سے انکار کا نام ہے جو سیاسی و عمرانی دباؤ کے تحت انسانی زندگی میں در آتا ہے۔اس جبری رویے اور دستور کو جب ایک ادیب یا شاعر اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہے تو اسے ہم مزاحمتی ادب کا نام دیتے ہیں۔

”ادب تخلیق کرنا بذات خود ایک مزاحمتی عمل ہے کیونکہ ادیب اپنے گرد و پیش سے موافقت نہیں کر پاتا اور اس کشمکش کی بنیاد پر وہ ادب تخلیق کرتا ہے۔ایک طرح سے تو سارا ادب مزاحمتی ہے اور ہر ادیب باغی ہے۔“ (۱۴)

اگر اردو ادب میں مزاحمتی ادب کے آغاز و ارتقا کے حوالے سے بات کی جائے تو قدیم شعری اصناف ”مرثیہ“ اور ”شہر آشوب“ کو مزاحمتی ادب کے آغاز کے طور پر لیا جاتا ہے۔لیکن پاکستان میں مزاحمتی ادب کا آغاز باقاعدہ طور پر ضیا مارشل لاء کے دور میں ہوا تھا اور مزاحمتی ادب کا پہلا مجموعہ "گواہی" کے نام سے اعجاز رائی نے ترتیب دیا تھا۔مزاحمتی ادب ایک مخصوص حوالے یا تناظر میں تسلط کے خلاف لکھا جاتا ہے۔اور یہ تناظر کسی بھی طرح کا ہو سکتا ہے خواہ وہ سیاسی ہو یا سماجی اداروں کی اجارہ داری ہو یا جاگیردارانہ مسلمات، پادرانہ نظام یا پھر جنسی امتیاز کی بالادستی ہو۔مزاحمت رسم و رواج طے شدہ رویوں اور رائج اقدار کے خلاف بھی ہوتی ہے۔ایک ادیب اپنے معاشرے کی از سر نو تشکیل کرتا ہے۔فرسودہ روایات اور بانجھ فکری تحریکوں کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کرتا ہے۔

مزاحمتی ادب کی ایک مخصوص قسم سیاسی رویہ، اقداری اور تاریخی بیانیے سے انکار کرنا بھی ہے۔ لیکن زیادہ تر مزاحمتی رویہ مارشلائی جبر واستحصال کے خلاف سامنے آیا ہے کیوں کہ ادیبوں نے ان حکمرانوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا جو زبردستی حکومت کرنا چاہتے تھے۔ مارشل لائی جبر واستحصال اور تشدد پر لکھنے والے ادیبوں کو حق کا نمائندہ قرار دیا جاتا ہے۔ آج بھی ان ادیبوں یا تخلیق کاروں کو ظالم سمجھا جاتا ہے جنہوں نے مارشل لاء کی حمایت کی۔ مارشل لائی دور میں کچھ ایسے ادیب بھی تھے جنہوں نے مزاحمتی رویہ اپنایا جس کی بنا پر ان کو قید و بند، کوڑے کھانے، ملک بدر کر دیا جانا اور بھی بہت سی سنگین سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ قوم کو ایسی ادیبوں پر فخر ہے جنہوں نے حق اور سچ کا ساتھ دیا۔ ۱۹۷۷ء کا مارشل لاء اور ذوالفقار علی بھٹو کی شہادت ہماری قومی تاریخ کے دو ایسے المیہ ہیں جنہوں نے لوگوں کی زندگیوں کو متاثر کیا۔ اس دور میں آزادی، انصاف، مساوات کے لئے جدوجہد اور جبر و تشدد کے خلاف بغاوت کرنا ادیبوں کا منشور تھا۔

> ''مزاحمت کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی جبر کی۔ ہم نے صرف اس ادب کو اپنے مضمون کا حصہ بنایا ہے جو جبر کی محض ایک سیاسی صورت یعنی سیاسی جبر بلکہ مارشلائی جبر کے خلاف مزاحمت کرتا ہے۔ ورنہ ادب میں مزاحمت کی تقریباً اتنی ہی صورتیں دیکھی اور دکھائی جاسکتی ہیں جتنی شکلیں جبر واستبداد کی ہیں۔'' (۱۵)

جبر کے خلاف لکھے جانے والا ادب مزاحمتی ادب کے زمرے میں آتا ہے۔ آزادی اور مساوات کے حق میں اور معاملات کے ظلم و ستم کے خلاف لکھے جانے والا ادب اصل میں ایک ایسا ردعمل تھا جس کا اظہار تو عوام نہ کر سکے لیکن ادیبوں نے اس جبر و تشدد کی نمائندگی اپنے ادب کے ذریعے کی۔

سیاسی عناصر میں ایک عنصر احتجاج بھی اہمیت کا حامل ہے۔ احتجاج کا جذبہ ہر جاندار کی فطرت میں شامل ہے۔ چاہے وہ جانور ہو یا انسان جب جب مزاج، اصول، پسند یا طبیعت کے خلاف کوئی بات ہوتی ہے تو احتجاجی جذبہ ابھرنا شروع ہو جاتا ہے۔ کسی بھی جاندار کو چھیڑ کر اس کے احتجاج کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح یہ انسانوں میں بھی مشترک ہے کمزور، صحت مند، بچہ، بوڑھا، امیر، غریب، مرد و عورت ہر ایک میں ایک احتجاجی رویہ فطرتاً موجود ہے۔ ان انسانوں میں ایک قبیلہ فنکاروں کا بھی ہے جو اپنے فن کے ذریعے احتجاج کرتے ہیں اور وہ اس کو اپنا پیدائشی حق یا فرض سمجھتے ہیں۔ یہ احتجاج کسی نہ کسی تبدیلی کا خواہاں یا منتظر ہوتا ہے۔ دنیا کے مختلف

خطوں میں مختلف ادوار میں جب جب تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی تب تب احتجاج نے سر اٹھایا۔ کہیں مارشل لاء جبر واستحصال کے خلاف، کہیں حکومتِ وقت کے خلاف، کہیں مذہبی سطح پر اور کہیں معاشرے اور ماحول کے خلاف احتجاج سامنے آیا۔ لیکن جب یہی احتجاج اجتماعی شکل میں سامنے آتا ہے تو انقلاب پیدا ہوتا ہے ۔اسی طرح قیامِ پاکستان کے بعد بھی حکومت وقت کے خلاف کہیں احتجاجی اور مزاحمتی رویے نظر آتے ہیں۔

"۱۹۹۹ء کے مارشل لاء نے خاموش اور غیر محسوس طریقے سے پاکستانی معاشرے کو اندر سے کھوکھلا کر دیا اس دور میں لکھے جانے والے ادب میں یہ کھوکھلا پن اور اس کا دکھ واضح اور غیر واضح طور پر محسوس ہوتا ہے یہ بھی مزاحمت کا ایک غیر معمولی رویہ ہے جو عام مزاحمت سے مختلف ہے۔" (۱۶)

"دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ جہاں جہاں یہ طبقہ اٹھ کھڑا ہوا ہے، ناانصافی اور ظلم کی کوئی طاقت اسے روکنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ وقت آرام کرنے کا نہیں ہے بلکہ اپنی ذمہ داری کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے اور اٹھ کھڑا ہونے کا ہے۔۔۔۔۔ احتجاجی مظاہرہ کرنے کے اپنے طریقے اور اپنی سوچ ہے۔ اس میں اختلاف ہو سکتا ہے مگر مقاصد سے ہرگز نہیں۔ ہم ان تمام جذبوں اوران مقاصد کے لئے اٹھنے والی آوازوں کی قدر کرتے ہیں۔۔۔ ملک میں امن وامان، ہم آہنگی، قوت برداشت اور سماجی ومذہبی رواداری کے ماحول کو فروغ دینے میں فوراً پہل ہونی چاہیے۔" (۱۷)

سیاسی عناصر میں ایک عنصر آزادی بھی ہے آزادی کا مفہوم صرف سیاسی آزادی ہی نہیں بلکہ معاشی، اخلاقی، ذہنی اور تمدنی آزادی بھی ہے۔ سیاسی آزادی سے کہیں زیادہ انسان کی معاشی، تمدنی، اور ذہنی آزادی ضروری ہے۔ اور آزادی کا صرف اتنا ہی مطلب نہیں ہے کہ گورے کی جگہ کالا حکمران ہو یا ہندو کی جگہ عیسائی یا مسلمان کی حکمرانی ہو بلکہ یہ ہے کہ انسان کو دو وقت کی روٹی ملے انسانی آزادی میں روٹی، ثقافت، خیال اور تمام خوبصورت چیزوں کا شمار آزادی میں ہوتا ہے۔

" میں شخصی آزادی کا قائل ضرور ہوں لیکن صرف اس حد تک کہ جہاں وہ بحیثیت مجموعی انسانیت کے مفاد کے خلاف نہ جائے۔ یہی حال جماعتی آزادی کا ہے اور

سیاست کی آزادی کا ہے کسی بڑی جماعت یا ریاست کو اس حد تک مطلق العنان نہ ہونا چاہیے کہ وہ قومی یا بین الاقوامی سطح پر جو چاہے کر سکے۔" (۱۸)

ادیبوں کے ہاں ان کی نثر اور شاعری میں ایک جذبہ جو نمایاں ہے وہ آزادی کا جذبہ ہے اس کو بھی سیاسی عنصر کے طور پر لیا جاتا ہے۔کوئی بھی ادیب سیاسی آزادی کے بغیر ادب تحریر نہیں کر سکتا۔بعض لکھنے والے تو اس عنوان کو ہی ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ بھلا ادب کا سیاست سے کیا تعلق ہے؟ یا ادب کا فرائض سے کیا تعلق ہے؟لیکن اگر وہ اپنے اس جملے پر غور کریں تو اندازہ ہو گا کہ اگر شعوری نہ سہی غیر شعوری طور پر ہی ادیب سیاست سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔آزادی کا جذبہ نہ صرف عوام بلکہ ادیبوں میں بھی موجود ہوتا ہے کہ وہ آزادانہ طور پر اپنی تحریروں میں ملکی سیاسی صورتحال کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔اور وہ چاہتے ہیں کہ ان پر اظہارے رائے کی پابندی نہ ہو۔جو ادیب اس بات کا دعوٰی کرتے ہیں کہ ان کی تحریروں میں سیاسی عناصر موجود نہیں ہیں تو یہ بات درست نہیں ہے۔

"جو آج ادیب سیاست کا تمسخر اڑتے ہیں وہ دراصل ایک قسم کی سیاست ہی کا مظاہرہ کر رہے ہوتے ہیں۔۔۔اور اہل قلم اور اہل فن اگر یہ سیاست قبول کر لیں تو بڑی خطرناک سیاست ہے کہ بھلا ادب و فن کا سیاست سے کیا رابطہ! مثال کے طور پر اگر کوئی ادیب ،ادیبوں کے کسی گروہ کی سیاست بازی پر لعن طعن کرتا ہے تو درحقیقت وہ اس سیاست کا شعوری یا غیر شعوری آلہ کار ہوتا ہے۔" (۱۹)

ذاتی طور پر میرا یہ خیال ہے کہ انسان کے اندر آزادی کا جذبہ موجود ہونا چاہیے بالخصوص ادیبوں میں اس جذبے کا موجود ہونا ضروری ہے۔ہم مسلمان ہیں اور مسلمان آزادی کے سلسلے میں کسی سمجھوتے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔عزت مندانہ زندگی صرف آزادی کی زندگی ہوتی ہے اور غلامی سے بڑھ کر کسی بے آبروئی کا انسان تصور نہیں کر سکتا سیاسی لحاظ سے اگرچہ ہم آزاد بھی ہو جائیں مگر تہذیبی،معاشرتی اور تعلیمی لحاظ سے ہم بہت حد تک غلام رہے۔آزادی نہ ہونے کی وجہ سے ہم اپنی آنے والی نسلوں کو احساسِ کمتری میں منتقل کر رہے ہیں۔

"سیاسی آزادی، یقیناً بہت بڑی بلکہ سب سے بڑی نعمت ہے مگر اس آزادی کو بر قرار رکھنے کا
طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی قومی انفرادیت کو پہچانیں کیوں کہ صرف اس طرح ہمارے آزاد
وجود کا جواز ممکن ہے۔"(۲۰)

لفظ آزادی کے دو اہم مخصوص پہلو ایسے ہیں جن کا ہمیشہ طور پر ادراک نہیں کیا جاتا پہلی بات یہ ہے کہ یہ لفظ صورتحال کا نا مکمل بیان ہے یہ کہنا کہ کوئی شخص آزاد ہے ایک ایسی بات کہنا جس کا مفہوم مکمل ہر گز نہیں ہے ۔دوسرا مخصوص پہلو لفظ آزادی کا یہ ہے کہ اس میں پسند اور تعریف کا مفہوم مضمر ہے۔لیکن یہاں سیاسی آزادی کی بات ہو رہی ہے لہذا سیاسی آزادی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب ریاست عوام کی اپنی ریاست بن جاتی ہے۔اور ایک بار جب ریاست کو عوام کی اپنی ریاست سمجھ لیا جائے تو ریاست کے اختیارات محدود کر کے آزادی کی حدود کو وسعت دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔کیوں کہ ریاست عوام کے عزم کی مظہر ہے اور اس کے اقدامات عوام کی آزادی کے مظہر ہیں۔سیاسی آزادی کے مثبت تصور میں یہ خامی ہے کہ آزادی جتنی دلکش نظریے کے طور پر ہے اتنی عملی حیثیت سے نہیں۔ایک طرف وہ لوگ ہیں جن کے نزدیک اخلاقی آزادی کا مطلب صرف یہ ہے کہ آدمی جو کچھ کرنا چاہے اس کی راہ میں کوئی مزاحمت نہ ہو دوسری طرف وہ لوگ ہیں جن کے نزدیک آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی وہی کچھ کرے جو اسے کرنا چاہیے۔

مثبت سیاسی عناصر میں انصاف پسندی کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ایک ادیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ انصاف پسندی کو بھی اپنی تحریروں کا موضوع بنائے۔کوئی بھی ملک اور اس کے عوام انصاف پسندی کے بغیر کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ارسطو اور دوسرے یونانی مفکر بھی یہ سمجھتے تھے کہ انصاف ایک مخصوص قسم کی مساوات ہے۔لیکن اس میں انھوں نے یہ اضافہ بھی کیا کہ انصاف کا مطلب صرف یہ نہیں کہ ہر شخص کو ایک جیسا سمجھا جائے۔یہاں انصاف کا مطلب قانون کی سچائی اور غیر جانبدارانہ تشریح ہے۔

"خدارا اس مملکت کو عدل و انصاف اور تناسب اور توازن سے محروم رکھنے والوں کا
ساتھ نہ دیں۔کیوں کہ یہ وہی ہیں جن کے برسوں کے طرزِ عمل سے مایوس ہو کر ہمارے
بعض اہل قلم اور اہل فن نے اپنی ذات کے اندر گھس کر بیٹھ جانے میں ہی

عافیت دیکھی ہے۔ انھیں کم سے کم یہی سوچنا چاہیے کہ ان کی یہ اسیری ذات بھی تو

مروّجہ سیاسی اور نتیجتاً معاشی نظام کا ہی ایک رد عمل ہے۔" (۲۱)

اگر منفی سیاسی عناصر کے حوالے سے بات کی جائے تو اس میں لا قانونیت، بد عنوانی اور غلامی جیسے عناصر شامل ہیں۔ اردو ادب میں ان عناصر کو بھی ادیبوں نے اپنی تحریروں کا حصہ بنایا اور یہ عناصر نثر اور شاعری دونوں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ اگر چہ ہمارے بڑوں نے زندگیوں کا کچھ حصہ غلامی میں بسر کیا لیکن اپنے ہی ملک میں رہ کر سیاسی غلامی کو قبول کرنا ایک الگ بات ہے۔ ادب زندگی کا اظہار اور ہمیں ایسے ادب کی ضرورت ہے جس میں جمہوری معاشرہ آزادی کی فضا کو برقرار رکھے اور غلامانہ ذہنیت کو ختم کرنے کے لئے عملی قدم اٹھانے چاہیے جو دو سو سالہ دورِ غلامی سے ہمیں ذہنی و فکری ورثے میں ملی ہے۔ ایک ہی ملک میں رہتے ہوئے علاقائی تعصبات سے نجات حاصل کرنی چاہیے اور سب کے لئے یکساں فکر رکھنی چاہیے۔ غلامی سے چھٹکارا حاصل کر کے ایک انصاف پسند معاشرے کا قیام عمل میں لانا چاہیے کیوں کہ انصاف ہی کی وجہ سے صحت مند معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

"ادب، ادیب اور جمہوریت کے حامیوں کو ناانصافی کے اس عمل میں شریک نہیں

ہونا چاہیے اور قلم سے اس کے خلاف جہاد کرنا چاہیے۔ جمہوریت کے ارتقا میں یہی

وہ کردار ہے جو ادب، ادیب، عہد حاضر کے تعلق سے ادا کر سکتا ہے اور اسے یہی کرنا

چاہیے۔" (۲۲)

ترقی پسند رویہ بھی مثبت سیاسی عنصر کے طور پر سامنے آتا ہے۔ ترقی پسند کا لفظ ان لوگوں اور نظریوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جو ترقی کی حمایت کرتے ہوں۔ معاشرے میں کچھ ایسے افراد بھی موجود ہوتے ہیں جو ترقی پسندانہ رویہ رکھتے ہیں۔ جن کی سوچ اور فکر ترقی پسند عناصر پر پر مبنی ہوتی ہے۔ ترقی پسندی ایک تحریک بھی اور ایک رجحان بھی ہے۔ ترقی پسندی تحریک کی صورت میں ۱۹۳۶ء میں سامنے آئی ترقی پسندی دراصل چند مخصوص ہندوستانی اور بین الاقوامی، سیاسی اور سماجی حالات کا نتیجہ تھی ان کے پس منظر میں ادبی روایات اور پے بہ پے ہونے والے سیاسی، ثقافتی اور اقتصادی اسباب کی کارفرمائی فراموش نہیں کی جاسکتی ہے۔

"ترقی پسندی کوئی ڈھلا ڈھلایا، بنا بنایا مشینی فلسفہ نہیں ہے بلکہ ایک ایسا نقطہ ہے جس کے دامن میں بڑی وسعت ہے دراصل یہ ایسا نظریہ ہے جس کے نزدیک رجعت پسندی اور ماضی پرستی، ظلم، نفرت، تنگ نظری، تشدد اور ناانصافی گناہ عظیم ہے۔ اور آزادی کی حمایت، نیکی، پاکیزگی، حسن، محبت، خلوص اور صداقت کا اظہار کارنیک ہے۔" (۲۳)

بدعنوانی کا مطلب ویسے تو بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اگر سیاسی بدعنوانی کی بات کی جائے تو یہاں اس کا مطلب حکومتی اہلکاروں کا طاقت کا غلط استعمال کرنا ہے۔ یعنی انتشار پھیلانا، رشوت لینا اور اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھانا۔ بدعنوانی کے لیے کرپشن کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ لفظ آج کل سیاست میں بہت زیادہ استعمال ہو رہا ہے بدعنوانی چھوٹے موٹے داروں سے لے کر حکومتی اداروں تک پہنچ گئی ہے۔ رشوت اور بدعنوانی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ یہ ایک لاعلاج مرض بن چکا ہے اس کی وجہ سے ہمارا ملک تباہی کی دلدل میں پھنس چکا ہے پڑھے لکھے اور ان پڑھ سب اس لاعلاج مرض میں مبتلا ہے۔ بدعنوانی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے رہنے سہنے کا انداز بدل چکا ہے ہر کوئی یہ چاہتا ہے کہ وہ امیر ہو نوکر چاکر، بڑا گھر اور گاڑیاں ہوں۔ لیکن یہ سب کچھ تو تھوڑی آمدنی سے تو کمایا نہیں جاسکتا ہے اس لیے وہ آمدنی کے لیے ناجائز ذرائع کا استعمال کرتے ہیں۔

د۔ انوار احمد کے عہد کا سیاسی منظر نامہ

انوار احمد نے ملتان کی فضا میں آنکھ کھولی اور اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ درس و تدریس میں وقف کیا۔ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ آپ نے ادبی خدمات بھی سرانجام دیں۔ کالم نگاری، خاکے، مقالے، افسانے، ڈرامے، فلیپ پر آراء، تحقیقی و تنقیدی مضامین اور کتابوں وغیرہ پر تبصرہ بھی لکھے۔ انوار احمد کا زیادہ تر رحجان تنقید کی طرف تھا کیوں کہ وہ تنقید میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے اور افسانے پر تنقید کرنے میں آپ نے دلچسپی کا اظہار کیا کیونکہ افسانہ نگاری سے ان کو گہرا لگاؤ تھا۔ افسانے سے آپ کو اس قدر لگاؤ تھا کہ آپ نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع بھی "اردو مختصر افسانہ اپنے سیاسی اور سماجی تناظر میں" جیسے موضوع کا انتخاب کیا۔ آپ کے اس مقالے میں اردو کے پہلے افسانہ نگار علامہ راشد الخیری سے لے کر جدید دور کے افسانہ نگاروں کی

خدمات کا جائزہ موجود ہے۔ انوار احمد نے اپنی ساری زندگی افسانے کے مطالعے اور تجزیے میں صرف کی اور اس کے نتیجے میں انہیں افسانے کی روایت کا گہرا شعور حاصل ہوا۔

انوار احمد ۱۱ جون ۱۹۴۷ء کو ملتان میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم ملتان کے ہائی سکول سے ہی حاصل کی۔ آپ نے ایم اے کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی لاہور سے حاصل کی اور پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی کا رُخ کیا۔ ان کی ذہنی و فکری آبیاری میں ان کے ذوق کے مطالعہ کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ انوار احمد کو بچپن ہی سے کہانیاں پڑھنے اور لکھنے کا شوق تھا اور اسی شوق کی وجہ سے ان کا رجحان افسانے کی طرف ہوا اور کالج کے زمانے ہی سے انھوں نے افسانے لکھنے کا آغاز کر دیا۔ افسانے کا فن اور روایت ان کے شعور کا حصہ بن گیا۔ افسانے کے فکری و فنی ارتقا پر ان کی گہری نظر تھی اور اسی لیے جب افسانہ جدیدیت کی تحریک کے زیر اثر کہانی، پلاٹ اور بعض دوسرے کرداروں سے محروم ہو رہا تھا اور محض ایک خیال اور تصور بن کر رہ گیا تھا تو تب آپ نے افسانے کے فنی لوازمات کا خیال رکھتے ہوئے جدید افسانے تحریر کیے۔ آپ کی پہلی کہانی ۱۹۶۸ء میں ''امر'' کے نام سے نخلستان میں چھپی اور یہاں سے آپ کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا ہے۔ یہاں سے آپ کے افسانوں کی اشاعت کا آغاز ہو گیا یکے بعد دیگرے آپ کے تین افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ آپ کا پہلا افسانوی مجموعہ ''ایک ہی کہانی'' کے نام سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔ اسی طرح آپ کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''پہلے سے سنی ہوئی کہانی'' کے عنوان سے ۲۰۰۳ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ آپ کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''آخری خط'' کے نام سے ۲۰۱۰ء میں فیصل آباد سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ''یادگار زمانہ ہیں جو لوگ'' کے نام سے ۲۰۰۸ء میں خاکے بھی شائع ہوئے۔

> ''انوار احمد کے سبھی افسانوں کا یہ امتیازی نشان ہے کہ ان کے افسانوں کا آغاز ڈرامائی اور قاری کو اپنی گرفت میں لینے والا ہوتا ہے اور اختتام چونکا دینے والا اور اس انداز کے لئے بڑی منفرد زبان استعمال کرتے ہیں ایسی زبان جو افسانے کے مجموعی مزاج سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔'' (۲۴)

انوار احمد نے جب افسانہ نگاری کا آغاز کیا تو ان کے سامنے اردو افسانے کی ایک روایت موجود تھی۔ فکری و فنی لحاظ سے افسانے نے مختلف تحریکوں اور روایتوں کے اثرات قبول کیے۔ اس دور میں افسانے نے کہیں کروٹیں

بدلیں مثلاً مزاج نگاری ، حقیقت نگاری ،رومانیت اور مقصدیت کی تحریک ،ابہام واسراریت اور علامت و تجریدیت وغیرہ۔انوار احمد باقاعدہ طور پر افسانوں کو پڑھنے والے ذہین نقاد ہیں۔ان کے ہاں روایت اور جدت کا ایک خوبصورت امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔آپ نے افسانے کے اسلوب،بیان اور جدت کا خاص خیال رکھا اور افسانے کے اولین اور بنیادی عناصر کو نظر انداز نہیں کیا۔

انوار احمد کے افسانے تجریدی ہوں یا علامتی،استعاراتی ہو یا شعور کی رُو پر مبنی ہوں لیکن ان میں ایک کہانی موجود ہے اور اسی وجہ سے ان کے افسانے قاری کے جذبات کا ساتھ دیتے ہیں۔آپ نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز ساٹھ کی دہائی کے آخر میں کیا۔اس وقت ترقی پسند تحریک اپنے آخری مراحل میں تھی اور اس کے علاوہ "اسلامی ادب "اور "پاکستانی ادب کی تحریک" بھی ناکام ہو چکی تھیں۔اور دوسری طرف معاشرتی وسیاسی مسائل نے قومی بے سمتی کو جنم دیا جس کا نتیجہ مجموعی لاتعلقی اور بے حسی کی صورت میں سامنے آیا۔سماجی،ادبی اور سیاسی پس منظر کے نتیجے میں ادبی رجحان خارجیت کی بجائے داخلہ کی طرف مڑ گیا۔اور افسانے میں نئے اسلوب، تجربے،ہیت اور موضوعات سامنے آنے لگے۔

> "انوار احمد کے یہاں غربت،خوف،یاس، نفرت،منافقت،پابندی افکار واظہار وغیرہ
> جیسے جذبے shocking Treatment کے طور پر آتے ہیں۔ان کے افسانوں
> میں Shocking End نہیں ہوتا بلکہ ان کے تیکھے جملے،کہانی کی کشمکش اور کردار
> جب چونکتا ہے تو سوچتا ہے اور جب سوچتا ہے تو مسائل کا کوئی نہ کوئی حل سامنے آہی
> جاتا ہے یہی انوار احمد کا مدعا اور منشا ہے۔" (۲۵)

۱۹۷۰ء میں مارشل لاء کے خلاف معاشرتی اور سیاسی رِدعمل اور مزاحمت کا آغاز ہوا جس نے مزاحمتی ادب کو پروان چڑھایا اس دوران افسانے نے داخلیت کی بجائے خارجیت کی طرف سفر کیا۔مگر مارشلائی پابندی کی وجہ سے علامتی اور تجریدی اسلوب کو اپنایا گیا۔اور خارجی حقائق کو علامتوں ،داستانوی اسلوب،تصورات،تمثیل کاری اور اساطیری انداز وغیرہ میں چھپا کر بیان کیا گیا۔اس طرح وطن سے وابستگی کا احساس پیدا ہوا مگر جمہوریت پر مارشل لاء کا شب خون جاری رہا۔

اگر انوار احمد کے سیاسی منظر نامے کے حوالے سے بات کی جائے تو انوار احمد نے جب باقاعدہ طور پر تخلیقی سفر کی ابتدا کی تو ملکی آئین ایوب خان کی آمریت کے پنجرے میں بند تھا۔۱۹۵۹ء میں جنرل ایوب خان نے محترمہ فاطمہ جناح کو حکومتی انتخاب میں شکست دی تو انوار احمد کے رومانوی انداز نے سیاست کو اپنی محبوبہ کا روپ دیا اور اپنے انداز سے آمریت کے اوچھے ہتھکنڈوں کے خلاف مزاحمت اور احتجاج کو جاری رکھا۔اس کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کے دور کا آغاز ہوا تو بھٹو کے کئے گئے وعدوں میں لوگوں کو اپنی منزل دکھائی دینے لگی۔ مگر ضیا الحق کے مارشل لاء نے ان دلدادوں کے خوابوں کو چکنا چور کر دیا۔اور اپنے راستے کو ہموار کرنے کے لئے ذوالفقار علی بھٹو پر قتل کا الزام لگا کر پھانسی پر لٹکا دیا۔یہ وہ سیاسی عہد نامہ تھا جس کا گہرا اثر انوار احمد کے دل و دماغ پر ہوا۔ جس کے نتیجے میں انوار احمد کی نثر میں مزاحمت ،اصلاح ،انقلاب ،احتجاج،انصاف پسندی ،ترقی پسندی،لاقانونیت ،ناانصافی اور آزادی اظہار کی پابندی جیسے عناصر سامنے آئے۔

جمہوریت پر مارا گیا شب خون ،مارشل لاء کے دوران لکھنے اور تقریب پر پابندی لگادی گئی۔ بھٹو کی پھانسی اور جمہوریت کے متوالوں کا ظلم و ستم کی داستان،چالاکی،دھوکہ دہی،لالچ اور منافقت کے ذریعے حق کے علمبرداروں کو خریدنے کی کوشش کی گئی۔ مخالفین کو شکست دینے کے لیے اُوچھے اور پیچ ہتھکنڈوں کا استعمال کیا گیا۔اور اس کے علاوہ مذہبی اصطلاحات اور روشن خیالی کے سدّباب جیسے موضوعات بھی انوار احمد کی تحریروں میں دکھائی دیتے ہیں۔

> ”مارشل لائی جبر کے خلاف لکھتے ہوئے ان کے لہجے کی تندی اور تلخی کچھ زیادہ ابھرتی دکھائی دیتی ہے۔ کہیں کہیں محض طنز سے کام لیا گیا ہے۔لیکن بسا اوقات زبان و محاورہ خوفناک حد تک اکبر ہوا نظر آتا ہے۔“ (۲۶)

انوار احمد کے ہاں مزاحمت، نفرت، غصہ اور احتجاج جیسے رویے پائے جاتے ہیں۔ان کی نثر میں معاشی و سماجی مسائل ،مارشل لائی جبر واستحصال،پاکستان کی سیاسی صورتحال جیسے موضوعات کثرت سے دکھائی دیتے ہیں۔۸۰ کی دہائی میں پیش آنے والے تین واقعات یعنی سقوط ڈھاکہ،ضیائی مارشل لاء کا جبر تشدد اور ذولفقار علی بھٹو کی پھانسی نے ملک میں معاشی،سیاسی اور معاشرتی سطح پر ایسے اثرات مرتب کیے جنہوں نے اردو ادب کو نئے مسائل سے دوچار کر دیا ہر طرف خوف،مایوسی،بداعتادی،عدم شناخت، گھٹن اور تنہائی جیسے مسائل ادب کا

موضوع بن گئے۔ یہاں سے انوار احمد کا ادبی سفر بلندیوں کو چھونے لگا۔انوار احمد کے ہاں موضوع کا پھیلاؤ ،انتخاب اور اسلوب کا رنگ ان کے عہد کے سیاسی منظر نامے کی دین ہے۔

"ملک کی سیاسی اور سماجی صورتحال بھی ان کے افسانوں میں نمایاں ہے۔دور آمریت اور اس کے اثرات یعنی پابندی افکار کا اظہار جو حب الوطنی کی دلیل ٹھہرتی ہے۔ مذہبی Explotitation، استحصالیوں کے خلاف کمزور ترین جذبہ ایمانی،ایسے میں ہمارے ادبا،اصحاب فکر و دانش اور سیاسی رہنماؤں کا کردار،یہ وہ تمام موضوعات ہیں جو ان کے افسانوں کو اہم بناتے ہیں۔" (۲۷)

ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کی وجہ سے جمہوریت کو کافی نقصان ہوا اور رومان پسند جو سوچنے سمجھنے کے قابل تھے وہ تمام صلاحیتوں سے محروم ہو گئے۔انوار احمد نے بدترین اور طویل یا مارشل لاء کی عکاسی علامتی اور استعاراتی انداز میں کی۔ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دوران اہل قلم دانشوروں اور اہل علم پر پابندی لگا دی گئی اور ان سے کہا گیا کہ وہ صرف اتنا بولے اور لکھے جو ان سے کہا جائے۔یعنی حکومت کے خلاف بولنے اور لکھنے کو جرم قرار دیا گیا۔انوار احمد نے مذہبی اور سماجی اصطلاحات کی حقیقت جو پردے میں تھی اس کی نشاندہی کی۔کیونکہ یہ بات طے ہو گئی تھی کہ جو حکومت کے خلاف بولے گا یا لکھے گا وہ ریاست کا غدار ہو گا۔انوار احمد کے سیاسی منظر نامے پر اگر غور کیا جائے تو اس وقت جب انوار احمد کی تحریریں منظر عام پر آئیں تو ضیا مارشل لاء کا دور تھا لوگوں پر جبر و تشدد کیا گیا کوڑے مارے اور جیلوں میں ڈال دیا گیا۔

"بھٹو کی پھانسی اور ضیا الحق دور کی بندشوں نے کہانی کو میرا جذباتی رفیق اور اپنے جیسے رومانی سادہ لوحوں سے رابطے کا وسیلہ بنا دیا جو یہ سمجھتے تھے کہ ان کی کہانیوں اور شعروں سے سجے پمفلٹ سے امریکی منشا سے منسلک ہمارے فوجی کی بندوق کا رُخ اور جج کے قلم کا تیور بدل سکتا ہے۔" (۲۸)

انوار احمد کی تحریروں میں ۱۹۷۷ء اور ۱۹۹۹ء کے مارشل لاء کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔ہمارے ملک پاکستان میں سیاسی جبر تشدد کے خلاف لکھے جانے والے ادب کا آغاز تقریباً ۱۹۹۵ء میں ہوا۔ضیائی دور کے جبر و استحصال اور ظلم و ستم کے خلاف پاکستان کی تمام زبانوں میں لکھی جانے والی تحریروں کے انتخاب اکادمی نے شائع کیے۔یہ

انتخاب ۱۹۹۹ء سے ۲۰۰۸ء تک کے عرصے کا احاطہ کرتا ہے۔ ۱۹۹۹ء میں ایک بار پھر جمہوری نظام پر شب خون مارا گیا اور ملک بدترین دہشت گردی، ذہنی اور فکری غلامی کی زنجیروں میں جکڑا گیا۔ اس پُر تشدد مہم جوئی کے اثرات جہاں براہ راست قومی سیاست پر پڑے اس سے ہمارا پورا سماجی ڈھانچہ رویے اور افکار بھی متاثر ہوئے۔ ملک کے دیگر ادیبوں کے ساتھ ساتھ انوار احمد نے اس سیاہ دور کو تحریری صورت میں محفوظ کیا انوار احمد کی تحریروں کے موضوع اور کردار کہانیوں میں تحلیل ہو کر جذبوں میں طوفان برپا کر دیتے ہیں۔ انوار احمد کے افسانوں اور خاکوں میں استعمال کیے گئے جملے روح کی گہرائیوں کو چھوتے ہیں۔

انوار احمد کا یہ خاصا رہا ہے کہ وہ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کو صبر سے برداشت کر لیتے تھے۔ لیکن اپنی مٹی کے ساتھ ناانصافی اور جبر و تشدد پر ان کا رویہ بہت سخت ہوتا ہے۔ انوار احمد ترقی پسند تحریک کی روایت کا فکری تسلسل ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری دوادوار پر مشتمل ہے پہلا دور ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۰ء کا ہے اور دوسرا دور ۱۹۹۰ء کے بعد کا ہے۔ پہلے دور میں انہوں نے جدیدیت کے فنی وسائل پر لکھا اور دوسرے دور میں مابعد جدیدیت کے فنی امکانات کو بھی اپنی کہانیوں میں بخوبی برتا ہے۔

> ''غریبوں کا استحصال، معاشرتی ناانصافی، سماجی ناہمواری، دولت کی غلط تقسیم، رویوں میں عدم مطابقت جیسے کئی موضوعات کو وہ ایک ہی سطر میں بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ وہ وسیع کینوس کو پھیلا کر سمیٹنے کے فن سے بھی آگہی رکھتے ہیں اور سمیٹنے کے بعد کہانی کے دیرپا اثر کو قائم رکھنے کے لیے سوال بھی چھوڑ جاتے ہیں۔ عصری سچائی کو بیان کرنے کا فن کوئی انوار احمد سے پوچھے اس قدر خوبصورت اور دلفریب انداز سے کڑوے سچ کو الفاظ کی چاشنی میں ڈبو کر تشبیہ اور استعارے کی سجاوٹ کے ساتھ ہمیں کھلا دیتے ہیں جو حلق سے اتر کر شِکم میں ہلچل مچا دیتی ہے۔'' (۲۹)

انوار احمد ایک دردمندانہ دل کے مالک ہیں وہ کسی بھی صورت میں ظلم و استحصال کو برداشت نہیں کر سکتے اسی لئے ان کے موضوعات میں ظلم و ستم کے خلاف مزاحمت اور احتجاج میں نظر آتا ہے۔ وہ ظلم ہوتا ہوا دیکھتے ہیں تو برداشت نہیں کرتے بلکہ چیخ اٹھتے ہیں لیکن اس چیخ میں ہنگامہ یا شور نہیں ہوتا بلکہ ان کی کہانیاں جذبوں میں طوفان برپا کر دیتی ہیں۔ ان کی تحریروں کے جملے نفس کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں

پاکستانیت رگ وپے میں رچی بسی ہوئی ہے۔ان کی تحریروں میں قائد کا وہ پاکستان دکھائی دیتاہے جوانحراف کے ساٹھ ستر برس پورے کر رہاہے۔جو مکمل طور پر اس نظریے اور معیارات کارد ہے جو اس ملک کو قیام میں لانے والوں نے کبھی مقرر کیا تھا۔اگر انوار احمد کے بارے میں یہ کہا جائے کہ انوار احمد کی کہانی پاکستانی تاریخی خود احتسابی کی داستان ہے تو بے جانہ ہو گا۔انوار احمد نہ تو سیاستدان ہیں اور نہ ہی تاریخ دان لیکن ایک ادبی مؤرخ اور احساس ادیب کی روشن طبع والی تمام بلائیں اور عذاب خود پر برداشت کر رہے ہیں اسی لئے اس نا انصافی ،انحراف، تفریق،استحصال کے خلاف احتجاج ان کے افسانوں کا خارجی چہرہ تو ہے ہی لیکن داخلی سطح پر بھی انہی عوارض کے درد اور تکلیف سے کراہ رہے ہیں۔

"انوار احمد کے یہاں اجنبیت کے منطقے تنہائی کا کرب،ٹوٹنے کا نوحہ اور لاتعلقی کا اظہار نہیں وہ جانی پہچانی دنیا کا مسافر ہے۔ اس کو ایک ایک شے کی پہچان ہے اس کے پاس دیدہ بیناہے وہ کور چشم نہیں کہ زمین پر اس کے قدم نہ ٹکیں۔اس کی آنکھیں تو چیزوں کی تہہ تک پہنچتی ہیں اور حقیقت کو پالیتی ہیں۔" (۳۰)

انوار احمد کی نثر میں تنہائی کا کرب اور لاتعلقی کا اظہار نہیں ہے وہ سماج کی حقیقتوں اور گہرائیوں کو بہت اچھے سے جانتے اور سمجھتے ہیں انہیں ہر چیز کی پہچان ہے ان کی آنکھیں اور دل ودماغ ایسا ہے کہ ہر چیز کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ سیاست روز مرہ کے استعمال میں آنے والا اردو زبان کا ایک لفظ ہے۔انسانی زندگی میں اس لفظ کی بہت اہمیت ہے۔مذہب اسلام میں سیاست کا مرکز عدل وانصاف ہے وہ عدل وانصاف جو عقائد و مکاتب خیال سے بالاتر ہو جو انسانی فلاح و بہبود پر مبنی ہو۔ جس میں رنگ ونسل کا امتیاز نہ ہو۔ملک و قوم انسانیت کی عزت اور بنی نوع انسان کا احترام ملحوظ ہو۔سیاسی آزادی اپنے جدید معنی میں عمومیت کے ہم معنی ہیں عمومیت دو طرح کی ہوتی ہے ایک براہ راست اور دوسری بالواسطہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ براہ راست عمومیت میں ہر ایک شہری کو حکومت کے انتظام میں درست شرکت حاصل ہوتی ہے اور بالواسطہ عمومیت سے مراد یہ ہے کہ جس میں حکومت کا کام چلانے کے لیے شہری اپنے نمائندے منتخب کرتے ہیں۔

ادب اپنے عہد کو بہترین انداز اور الفاظ کے ساتھ محفوظ کرتا ہے۔ اور اپنے دور میں ہونے والے واقعات کی سچی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں انسانی زندگی میں ہونے والے واقعات اور تبدیلیوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ادب پر سیاست کے اثرات نہ صرف عہد حاضر میں دکھائی دیتے ہیں بلکہ ادب کی روایت پر نگاہ دوڑائی جائے تو سیاست کے محرکات ادب پر صاف عیاں ہیں۔ ادب سیاسی حالات کے کے زیر اثر ہی مختلف طریقوں اور وسیلوں سے پروان چڑھا شروع میں ادب کی سرپرستی صوفیاء اور اولیاء نے کی پھر اس کے بعد ادب کی سرپرستی برصغیر پاک وہند نے کی۔ اس کے علاوہ شعرا اور ادیبوں کی ہجرت اور نقل مکانی کی وجہ سے ادب کی شعری اور نثری اسلوب میں اضافہ ہوتا گیا۔

بیسویں صدی کے ساتھ ہی سیاسی بحران کا بھی آغاز ہو گیا۔ ہندوستان نے اپنے نظریات کو پیش کرنے کے لئے اردو ادب کو ہی منتخب کیا۔ تحریک آزادی میں ترقی پسند تحریک کا بڑا اہم کردار ہے ترقی پسند تحریک سے اردو ادب میں بیداری پیدا ہوئی۔ جنگ عظیم اول اور جنگ عظیم دوم میں سیاسی حالات ظاہر ہوئے تو اردو ادب میں ہنگامی اور احتجاجی ادب کا آغاز ہوا۔ اس دور کے ادیبوں نے مسلم ممالک پر الزام تراشی ،خودکشی، مزاحمت ، دہشت گردی اور عالمی قوتوں کی کشمکش کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ایسے سیاسی حالات کی بنا پر بہت سی ادبی تحریکوں کو ادب میں آنے کا موقع ملا۔ جس میں سرریلزم، تجریدیت، جدیدیت، علامت نگاری، میڈ اڈازم اور وجودیت جیسی تحریک شامل ہے۔ ان تمام تحریکوں کا اردو ادب پر گہرا اثر ہوا اور فنی لحاظ سے ان تحریکوں نے اردو ادب کو بہت متاثر کیا۔

سیاست کا مطالعہ کسی خاص قوم کے سیاسی رویوں اور عمومی مزاج کا مطالعہ ہے۔ پاکستانی سیاست کی اگر بات کی جائے جس میں اتحاد اور وفاداریاں تسلسل کے ساتھ وجود میں آتی رہی ہیں۔ اور مخصوص حالات کی وجہ سے سیاسی وابستگیوں میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ ایک مسلک کی سیاست وہاں کی شخصیات کے گرد گھومتی ہے ۱۹۴۵

سے آمرانہ قوتوں اور جمہوری تصورات کے درمیان کشمکش شروع ہوگئی تھی۔ ملک میں ایک طبقہ جو فوجی حکومتوں کو خوش آمدید کہتا ہے۔

احتجاج کا لفظ در اصل ایک ایسا لفظ ہے جس کے مختلف معنی ہیں جس میں انکار کرنا ناپسندیدگی کا اظہار کرنا اعتراض کرنا مخالفت کرنا وغیرہ کے ہیں۔ اردو میں احتجاج کے مترادف مزاحمت کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور اس کو سمجھنے کے لیے انقلاب اور بغاوت کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے اگر ہم لغوی طور پر احتجاج کے معنی تلاش کریں تو اس کا مطلب خیال اور جذبے کا ہوگا جو کسی بھی وقت انسان کے دل و دماغ میں کسی کے خلاف پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ ایک مخالفت کا رویہ ہے جس میں بغاوت کا عنصر شامل نہیں ہوتا بلکہ احتجاج کرنے والے کی کمزوری کا پتہ چلتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو احتجاج وہی کرتا ہے جو بنیادی طور پر کمزور ہوتا ہے اور اسی لئے احتجاجی رویے میں بنیادی طور پر مفاہمت کے پہلو ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر حکومت سے کسی مطالبے کی تکمیل کے لئے جب کوئی تحریک چلائی جاتی ہے تو دراصل یہ احتجاجی رویہ مطالبے کے حصول تک برقرار رہتا ہے۔ دراصل اس کا مطلب یہ ہوا کہ احتجاج نہ تو بغاوت ہے اور نہ ہی انقلاب۔ ہاں اگر احتجاجی رویہ تحریک کی شکل اختیار کر لے تو اس میں بغاوت یا انقلاب کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ اردو ادب میں مزاحمت اور احتجاج کا آغاز شروع سے ہی ہو گیا تھا۔ جدیدیت سے پہلے اردو ادب میں مزاحمتی، احتجاجی، انقلابی اور بغاوتیں تجربے ہوئے تھے۔

انوار احمد موجودہ دور کے بہترین افسانہ نگار اور خاکہ نگار ہے وہ پیچیدہ احساسات اور خیالات کے مالک ہیں۔ ان کے اسلوب میں تازگی اور سلاست ہے ان کے افسانے انسانی نفسیات کی عکاسی بھی کرتے ہیں وہ جب معاشرے کے بسوں اور لاچاروں کے آنسو نہیں پونچھ سکتے تو ان کے لئے کہانی لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ حب الوطنی کو بھی انہوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا کیونکہ انہیں خود بھی وطن سے بے پناہ محبت ہے اس لیے

آسٹر وٹرف افسانے میں ایک ایسے آدمی کا ذکر کیا ہے جو بیرون ملک جانے کو ترجیح دیتا ہے اور اپنے وطن کو فراموش کرتا ہے۔

انوار احمد ایک صاحب اسلوب نثر نگار ہیں۔انوار احمد کے افسانوں میں ایک سبق ہے اگر وہ کوئی کہانی بیان کرتے ہیں تو اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے مثلاً اگر وہ اپنے افسانوں میں جاپان جیسے ترقی یافتہ ملک کا ذکر کرتے ہیں تو اس ملک میں بھی خود کشی ،لایعنیت، اطمینان کی کمی ،بے مقصدیت، اخلاقی اقدار کی پامالی اور بزرگوں سے بے اعتنائی کو سامنے بھی لاتے ہیں۔ انوار احمد نے زندگی کا مطالعہ ومشاہدہ بہت قریب سے کیا اور پھر اس مطالعے ومشاہدے میں جو کچھ حاصل کیا یا کھویا اس کو اپنی تحریروں کی اساس بنایا۔ آپ نے فرشتوں کو نہیں بلکہ انسانوں کو اپنے افسانوں میں کردار بنایا۔ وہ کبھی خوشیوں سے ہم کنار ہوتے ہیں اور کبھی محرومیوں اور المیوں سے۔ان کی کہانیوں کو پڑھ کے ایسے لگتا ہے کہ ہماری کہانی بیان ہو رہی ہے شاید اسی لیے کرداروں کا انجام بعض اوقات افسردہ بھی ہوتا ہے۔انوار احمد جدید اردو افسانے میں ایک معتبر نام ہے۔

انوار احمد کے افسانوں کی بنیاد حقیقت پر ہے وہ ایک باشعور فنکار ہیں۔ اگرچہ انوار احمد جدید افسانہ نگار ہیں لیکن ان کے سامنے اردو افسانے کی ایک روایت بھی موجود ہے۔ ترقی پسند تحریک جب اسی کی دہائی میں دم توڑ رہی تھی تو انوار احمد تخلیقی سفر کے لیے تیار تھے۔ پاک بھارت جنگ نے وطن سے محبت کا احساس پیدا کیا۔ انوار احمد چونکہ ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوئے ہیں اس لیے وہ اپنے افسانوں میں ترقی پسند رجحانات کو جگہ دیتے ہیں۔ غربت جہالت ابہام لایعنیت دور آمریت کے اثرات قومی وسیاسی منافقت سماجی ناانصافی جنسی اور نفسیاتی الجھن اپنے پورے منظر کے ساتھ دیکھائی دیتی ہیں۔ایوب خان کی آمریت بھٹو کی پھانسی اور ضیاء مارشل لاء نے انوار احمد کے دل ودماغ پر گہرے اثرات چھوڑے جس کی بنا پر انہوں نے احتجاج مزاحمت اصلاح انقلاب اور تبدیلی کو وسیلہ بنایا۔

حوالہ جات

۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں (ابتدا تا ۱۹۷۵ء)، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۴۰

۲۔ ایضاً، ص ۴۰

۳۔ فیض احمد فیض، ادبی ایڈیشن، روزنامہ نوائے وقت، لاہور، جنوری ۱۹۸۳ء

۴۔ احمد ندیم قاسمی، پس دیوار، بک مارک ٹیمپل روڈ، لاہور، بار اول ۱۹۹۳ء، ص ۱۰۱

۵۔ فرہنگ تلفظ، شان الحق حقی، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد پاکستان، طبع سوم، ۲۰۰۸ء، ص ۶۴۸

۶۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد پاکستان، طبع اوّل ۱۹۹۴ء، ص ۱۵۱۱

۷۔ وارث سرہندی، مؤلف، جامع علمی اردو لغت، علمی کتاب خانہ لاہور، طبع سوم ۲۰۰۳ء، ص ۹۳۶

۸۔ سید احمد دہلوی، مولوی، فرہنگ آصفیہ، مرتبہ، جلد سوم، اردو سائنس بورڈ، ۱۹۸۶ء، ص ۱۴

9.Aristole,politics, what is politics,Man is by a nature a political animal,page 3,2014,new York,A merica

۱۰۔ راجندر سنگھ بیدی، ادب اور سیاست، مشمولہ ادب، زندگی اور سیاست، مرتب محمد خاور نوازش، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۴۰۰

۱۱۔ اعجاز حسین، ادب اور سیاست، مشمولہ ادب، زندگی اور سیاست، مرتب خاور نوازش، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۳۳۱

۱۲۔ ژاں پال سارتر، بحوالہ معاصر ادب ڈاکٹر جمیل جالبی، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۳۲

۱۳۔ ممتاز شریں، سیاست، ادیب اور ذہنی آزادی، مشمولہ ادب، زندگی اور سیاست، فیصل آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۴۱۰

۱۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر، مزاحمتی ادب اردو، اکادمی ادبیات اسلام آباد پاکستان، ۱۹۹۵ء، ص ۴۸

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۹

۱۶۔ رشید امجد، ڈاکٹر، مزاحمتی ادب اردو، اکادمی ادبیات اسلام آباد پاکستان ۱۹۹۹ء۔۲۰۰۷ء، ۲۰۰۹، ص ۱۹

۱۷۔ محمد سلیم، مدیر، ادب اور احتجاج (سہ ماہی)، ادب سلسلہ، اپریل تا جون، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۲۰۲

۱۸۔ احمد حسن، کرشن چندر کے سماجی اور ادبی نظریات، نئی دہلی، ۱۹۴۷ء، ص ۴۳۰

۱۹۔ احمد ندیم قاسمی، تہذیب و فن، شرکت پرنٹنگ پریس لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۱۸۶

۲۰۔ ایضاً، ۱۹۴

۲۱۔ ایضاً، ۱۹۱

۲۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، معاصر ادب (ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۱۹۹۴ء، ص ۴۰

۲۳۔ احتشام حسین، سید، تنقید اور عملی تنقید، اترپردیش اردو اکادمی لکھنو، ۲۰۰۵ء، ص ۱۷

۲۴ مزمل حسین، پروفیسر ڈاکٹر انوار احمد کے افسانوں کا لسانیاتی مطالعہ، مطبوعہ انگارے، ملتان، جولائی ۲۰۰۶ء ص ۱۸

۲۵۔ شوکت نعیم قادری، نتائج فکر، بیکن ہاؤس ملتان، ۲۰۰۴ء، ص ۹۴

۲۶۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ (تحقیق و تنقید)، پورب اکادمی، اسلام آباد، فروری ۲۰۰۸ء، ص ۶۸۵

۲۷۔ قادری، شوکت نعیم، انوار احمد روشن آنکھوں والا کہانی کار، مشمولہ سطور شمارہ ۳، ملتان بیکن بکس، ۲۰۰۱ء، ص ۶۲

۲۸۔ انوار احمد، ڈاکٹر، دو چار باتیں اپنوں سے (دیباچہ) "آخری خط"، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۱۰

۲۹۔ شوکت علی، ڈاکٹر انوار احمد کے افسانوی پارے، روزنامہ نوائے وقت، ۱۳ اپریل ۲۰۰۴ء

۳۰۔ اے۔ بی اشرف، ڈاکٹر، کچھ نئے اور پرانے افسانہ نگار، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۴

باب دوم

انوار احمد کی نثر میں مثبت سیاسی عناصر کا مطالعہ

الف۔ انوار احمد کے افسانوں میں مثبت سیاسی عناصر

انوار احمد سیاسی عناصر کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ ان کی افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں سیاسی عناصر جابجا دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن یہاں انوار احمد کے افسانوں میں مثبت سیاسی عناصر کے متعلق بات ہو رہی ہے۔ سیاست کا زندگی کے ہر شعبے پر اثر ہونے کی وجہ سے ایک ادیب سیاسی اثرات کو محسوس کئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ انوار احمد نے بھی اپنے افسانوں میں سیاسی صورتحال کا ذکر چابکدستی سے کیا ہے۔ انوار احمد کے افسانوں میں ایک عنصر جو زیادہ نمایاں نظر آتا ہے وہ مزاحمت ہے۔ آپ کا افسانہ ''ایک ہی کہانی'' مزاحمت کی فضا کو بھرپور انداز میں پیش کرتا ہے۔ انوار احمد کے افسانے میں سیاسی جبر و استحصال کے نتیجے میں عوام کی جانب سے کی گئی مزاحمت کو بیان کیا ہے جب لوگ سیاسی جبر و تشدد کا نشانہ بن رہے تھے۔

> ''اور لوگ تھے کہ ساحل کو محفوظ جان کر اپنے لئے خندقین اور قبریں کھود رہے تھے اور ادھر وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ کنارے پر جان دینے کی بجائے سمندر میں خنجر کی طرح اتر جائے گا اس کے مدمقابل رات بھی تھی سمندر بھی اور ناعاقبت اندیش ساتھی بھی۔'' (۱)

انوار احمد کے اس افسانے میں کچھ کردار ایسے تھے جو سمندر کے کنارے کو اپنے لیے محفوظ سمجھ رہے تھے اور اپنے لئے خندقین اور قبریں کھود رہے تھے۔ لیکن ان میں ایک کردار ایسا بھی تھا جو مزاحمتی رویہ اپناتا ہے اور وہ کنارے پر جان دینے کی بجائے سمندر میں ڈوب جانے کو ترجیح دیتا ہے۔ یہاں پر اس آدمی نے بے بسی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے مزاحمتی رویے کو ترجیح دی اور حوصلے کی کشتی کو سمندر میں ڈال دیا۔ انوار احمد کے افسانے کے دوسرے حصے میں بھی کچھ مزاحمتی رویے واضح طور پر نمایاں ہیں۔ افسانے کے اس حصے میں اندھیری اور طوفانی رات کی منظر کشی کی گئی ہے۔ وہ آدمی جس نے کنارے پر مرنے کی بجائے سمندر میں ڈوب جانے کو فوقیت دی اور اس نے اپنی کشتی کو طوفانی لہروں میں ڈال دیا۔ کڑکتی بجلی نے ایک قہقہہ لگایا اور بارش چڑیل کی مانند رقص کرنے لگی۔ سمندر میں اس قدر خوف تھا اور ایسی لہریں اٹھائیں کہ اس رات چاند بھی نہ نکلا۔

"ہوا چیخ کر کہتی "تمہیں تھکنا ہے، تمہیں مرنا ہے، ہمیں لوٹنا ہے!" ہر مرتبہ یہ پیغام
اس کے عزم کے مستول سے اس طرح ٹکراتا کہ یوں محسوس ہوتا کہ ہوا لوٹ کر یہی
پیغام سمندر کو سنانے پر مجبور ہے بہت سی چھوٹی چھوٹی لہروں کو پہلو میں لے کر ایک تند
و تیز لہر ایسی آئی کہ کشتی پھر ہوا میں بلند ہوئی اور اب جو گری تو وہ کئی تختوں میں بدل
چکی تھی۔ مگر اس نے مضبوطی سے ایک تختے کو تھام رکھا تھا اور عین سمندر کے قلب کی
جانب بڑھ رہا تھا۔ "(۲)

انوار احمد کے ہاں مزاحمت زیادہ تر علامتی اسلوب میں نظر آتی ہے۔ یہاں بھی انھوں نے افسانے میں مزاحمت کو علامتی پیرائے میں بیان کیا ہے۔ کیونکہ بظاہر سیاسی جبر و تشدد کے خلاف اس افسانے میں مزاحمت نظر نہیں آتی۔ اس افسانے میں انوار احمد کا انداز علامتی ہونے کی وجہ مارشل لاء کے دوران حکومت کے خلاف لکھنے اور بولنے پر پابندی تھی اور جو حکومت کے خلاف لکھتا یا بولتا تھا اس کو غداری کا مرتکب قرار دیا جاتا تھا۔ افسانے کے اس اقتباس میں ہوا بار بار یہ پکار رہی ہے کہ تمہیں تھکنا اور مرنا ہے۔ لیکن آدمی کا عزم اس حد تک پختہ ہے کہ وہ مزاحمت کرتے ہی چلا جاتا ہے کشتی کا کئی تختوں میں ٹوٹ جانا بھی اس کے ارادوں کو پست نہیں کر سکا اور آدمی نے مضبوطی سے ایک ہی تخت کو تھام رکھا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ انوار احمد کا یہ پورا افسانہ ان کے مزاحمتی رویے کی عکاسی کرتا ہے۔ افسانے کا کردار پوری قوت کے ساتھ سمندر کی طوفانی اور ڈراؤنی لہروں کے خلاف مزاحمت کر رہا تھا۔ "ایک ہی کہانی " کے آخری حصے میں بھی مزاحمت کا غلبہ نظر آتا ہے۔

"جب ایک طوفانی لہر نے چنگھاڑ کر تختہ اس کے بازوؤں سے چھین لیا تو وہ اپنی تمام
قوتیں مجتمع کر کے طوفان کے خلاف اپنی آخری جنگ لڑنے لگا وہ موجوں سے لڑتا ہوا
اپنا راستہ بنا رہا تھا۔۔۔ رفتہ رفتہ اس کے بازو شل ہونے لگے آنکھیں مُندنے لگیں۔ تب اسے
محسوس ہوا کہ ہوا کی چیخیں لوریوں میں بدل رہی ہیں۔۔۔ طوفان کی سانس اکھڑ چکی تھی اور

سمندر سہم کر اسے تکے جا رہا تھا سمندر کے عین سینے میں پیوست ہونے سے پہلے اس نے
اپنے ان ساتھیوں کے بارے میں سوچا، ساحل پر جن کی خندقین قبریں بن چکی تھیں۔" (۳)

۱۹۷۷ء کے مارشل لاء کے دوران حکومت کے خلاف بولنے والے پر جبر و تشدد کیا گیا۔مارشل لاء کا یہ دور بدترین دور تھا اور ملکی تاریخ کا یہ ایک طویل ترین مارشل لاء بھی تھا۔عدالتوں میں بھی فوج کی حکمرانی تھی۔ لوگوں کو عبرت ناک سزائیں دی گئیں۔ صحافت اور ادب سے تعلق رکھنے والے صحافیوں اور ادیبوں کو سخت سزائیں دی یہاں تک کہ سیاسی کارکنوں، صحافیوں اور ادب سے تعلق رکھنے والوں پر کوڑے برسائے گئے۔جو لوگ مارشلائی نظام میں مداخلت کرتے انہیں کوڑے مار مار کر جسمانی اور ذہنی سطح پر مفلوج و معذور کر دیا۔تو ایسے حالات میں احتجاجی اور مزاحمتی رویوں کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ تھا۔اور اس احتجاج اور مزاحمت کا اظہار بھی واضح الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا تھا جس کے لیے استعاراتی اور علامتی اسلوب اپنایا گیا۔انوار احمد کے افسانوں کی بنیادی جہت احتجاج ہے۔

"وہ احتجاج کے لہجے میں بھی فنی تقاضوں کو اولیت دیتا ہے۔حالانکہ اس کی خواہش
ہوتی ہے کہ احتجاج اتنا بھرپور ہو کہ دشمن کی کمر توڑ دے لیکن اس طرح وہ اپنے
کرافٹ کی باریکیوں اور پہلوؤں کو ضائع کر کے مقصد حاصل کرنے کو ترجیح نہیں دیتا۔"
(۴)

انوار احمد کے افسانے "گونگی غراہٹ" میں ایک فقیر کا احتجاجی رویہ سامنے آتا ہے۔افسانے کا ایک کردار جو حاجی خواجہ کے محل تک جاتا ہے تو راستے میں ایک فقیر کی ہتھیلی پر چند سکے رکھ دیتا ہے۔وہ فقیر سکے لینے کی بجائے احتجاج کا مظاہرہ کرتا ہے اور سکے نالی میں پھینک دیتا ہے کیونکہ وہ یہ جانتا ہے کہ یہ سکے وہ حاجی خواجہ کی قے سے چنتا ہے۔ انوار احمد اپنے افسانوں میں اگر کہیں احتجاج بھی کر رہے ہوتے ہیں تو وہ احتجاج کے فنی تقاضوں کو نہیں بھولتے ہیں وہ پُرامن احتجاج کرتے ہیں حالانکہ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ احتجاج اس قدر شدید

ہو کہ دشمن کی کمر توڑ کر رکھ دے لیکن وہ کہتے ہیں کہ ہنگامہ آرائی کا کوئی فائدہ نہیں اور وقت کو ضائع کیے بغیر مقصد کو حاصل کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

"میں رات دن اس کی آواز سے ڈرتا ہوں، کٹے ہوئے نرغے سے نکلنے والے
لفظ مل کر کیا معنی ادا کرتے ہیں میں اس پر غور کرتا ہوں اور ڈرتا ہوں۔ میں ڈرتا
ہوں اس آواز سے جو برمے کی طرح میرے دل میں اتر جاتی ہے اور جس پر بجائے
لجاجت اور گر گراہٹ کے احتجاج اور اشتعال کا گمان گزرتا ہے۔" (۵)

افسانہ کا مرکزی کردار حاجی خواجہ ایک امیر آدمی ہے۔وہ کسی کو بے بس اور مجبور نہیں دیکھ سکتا وہ انسانی استحصال پر تلملا اٹھتا ہے اور لوگوں کی مدد کرنے میں وہ خوشی محسوس کرتا ہے۔ لیکن حاجی خواجہ بے پناہ شراب پیتا تھا۔ حاجی خواجہ کی طرح اس کے گھر والے بھی دریا دل اور انسان دوست تھے۔ حاجی خواجہ انسانیت پر ظلم تشدد اور بھوکے پن کو دیکھ کر احتجاج کا مظاہرہ کرتا ہے۔ لندن میں قیام کے دوران جب اس نے کچھ غریب دوشیزاؤں کو صرف سو پونڈ ملنے پر ماڈلنگ کے شکنجے میں جکڑا دیکھا تو اس نے احتجاجی رویہ اپنایا اور دو سو پاؤنڈ فی ہفتہ ان لڑکیوں کو دے کر آزاد کر دیا۔

"مجھے اس بڑبڑاہٹ اور بھنبھناہٹ سے وحشت ہوتی ہے۔ زینت مائی کیا کہنا
چاہتی ہے؟ لالہ مراد اور ماسٹر بشیر نے کیا کہا تھا؟ پٹھان لڑکے اور قادر بخش کی آنکھیں
کیا کہتی ہیں؟ اور گونگا فقیر کیا کہنا چاہتا ہے۔ جو میرے راستے میں کھڑا ہے میں ان سب
کی غراہٹ کو لفظوں میں اس لئے بھی بدلنا چاہتا ہوں کہ اپنے آقا حاجی خواجہ کو خبردار
کرکے انعام تو لے سکوں۔" (۶)

افسانے کے اس اقتباس میں یہ کردار باقی کرداروں کو بھی احتجاجی رویہ اپنانے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ یہ کردار کھل کر بولیں اور احتجاج کا مظاہرہ کریں۔ یہ افسانے کا وہ کردار ہے جو حاجی خواجہ کے ساتھ ہر وقت سائے کی طرح رہتا تھا وہ چاہتا ہے کہ زینت مائی، لالہ مراد، ماسٹر بشیر اور قادر بخش اپنے اپنے مسائل کے خلاف

احتجاج کا مظاہرہ کریں اور پھر یہ سب جا کر میں آقا حاجی صاحب کو بتاؤں اور ان سے انعام وصول کر سکوں۔بظاہر اس کردار کا مقصد لوگوں کو احتجاج پر اکسا کر حاجی خواجہ سے انعام وصول کرنا ہے۔

انوار احمد کے افسانوں کا ایک نمایاں عنصر یاس اور امید بھی ہے اور ان کے اکثر افسانوں میں امید دیکھائی دیتی ہے کیونکہ امید ایک ایسی چیز ہے جو انسان کے اندر ظلم و ستم اور نازیبا سلوک کے خلاف حوصلہ پیدا کرتی ہے۔امید کے ضمن میں انوار احمد کا افسانہ ''پہلے سے سنی ہوئی کہانی'' قابل ذکر ہے۔جس میں احتجاج اور مزاحمتی رویے کے بجائے ایک امید نظر آتی ہے۔جہاں نفرتوں اور سازشوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ امید کا عنصر نمایاں ہے۔افسانے میں میں ایک ماں کی بیمار بیٹی صرف اس شرط پر دوائی پینے کے لئے رضامند ہوتی ہے کہ اس کو وہ ایک ایسی کہانی سنائی گئی جو اس نے پہلے سے نہ سنی ہو۔کیوں کہ وہ اپنی ماں سے ایک ایسی کہانی سننا چاہتی ہے جس کے اندر امید ہو۔مگر جب اس کی ماں اس کو کہانی سنانا شروع کرتی ہے تو وہ ہر بار یہ کہتی ہے کہ اس نے یہ کہانی پہلے سے سنی ہوئی ہے۔

وہ تمام بادشاہوں کے بارے میں جانتی ہیں وہ کہتی ہیں کہ میں بادشاہوں،وزیروں ،امیروں ، محلات ، باغات ،سوداگروں اور غلاموں سب سے واقف ہوں طوطے مینا سے لے کر حاتم تک اور گیڈر سے لے کر تیس مار خان تک پھیلی دنیا کی تمام کہانیوں کے بارے میں مجھے علم ہے۔اس کے اندر ایک امید ہے وہ چاہتی ہے کہ وہ ان دیکھی دنیا کا سفر باپ کی انگلی پکڑ کر کرے۔چنانچہ اس کا باپ کمرے میں بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ وہ ایک ایسی کہانی کیسے تحریر کرے جو اس نے پہلے نہ سنی ہو۔وقت اور عمر کے ساتھ ساتھ بہت سی یادیں اور شکلیں گڈ مڈ ہو جاتی ہیں۔کیوں کہ ہر انسان کے بس میں یہ نہیں ہے کہ وہ جلی رسیوں،پھٹے ہوئے خیموں اور ٹوٹی تلواروں سے پھر سے شہر آباد کرے۔اور اس کو اس بات کی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ یقین اور امید سے بھرپور کہانی اس کو سنائے یا خوف سے متعلق۔

"اپنے بچوں کو زندگی کے یقین اور امید سے بھی محروم کردوں، تنگ آ کر میں نے کتابوں کا بکس کھولا کہ شاید پرانے یاس زدہ لفظوں نے نئے امید بھرے لفظوں کو جنم دیا ہو، بکس کھلتے ہی میں اور دہشت زدہ ہو گیا مکڑی کے جالوں نے ایک دقیانوسی مکروہ کہانی بُن رکھی تھی اور تمام کتابوں کی تتلیاں کسی جالے میں مردہ ہو کر لٹک رہی تھیں۔ مگر ان کے ادھ کھلے پر یہ گواہی ضرور دیتے تھے کہ جکڑے جانے سے پہلے انہوں نے مزاحمت ضرور کی تھی۔" (۷)

انوار احمد کے افسانوں میں دیگر سیاسی عناصر کے ساتھ ساتھ آزادی کا جوش و جذبہ بھی موجود ہے۔ وہ آزادی کے بہت بڑے خواہاں ہیں۔ انوار احمد کے مطابق اپنے ہی ملک میں رہنے والے لوگوں کو آزادی کے جذبے سے محروم نہیں ہونا چاہیے۔ انسان کو آزادی کے ساتھ اپنے جائز حقوق کا اظہار یا مطالبہ کرنا چاہیے۔ سیاست اور آمریت کے دور میں آزادی کی فضاؤں کا اظہار کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ آمریت نے ہر طرف جبر کی فضا پیدا کر دی تھی معاشرے میں رہنے والے افراد نفسیاتی اثرات کا شکار نظر آتے تھے کیوں کہ آمرانہ نظام حکومت میں اظہار رائے کی آزادی ممکن نہیں۔ ایسی صورتحال میں بے یقینی اور بے بسی کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ اسی لئے انوار احمد کے افسانوں میں آمریت کے خلاف احتجاج نظر آتا ہے۔ آزادی کے حوالے سے انوار احمد کا افسانہ "قومی مفاد میں مرتب کی جانے والی ایک رپورٹ" قابل ذکر ہے قومی مفاد میں مرتب کی جانے والی ایک رپورٹ کے عنوان ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے قوم کی بھلائی اور آزادی کے جذبے کو بھرپور انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کہانی میں قومی آزادی کے متعلق نظریات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس افسانے کی بنیاد تحریک آزادی پر ہے۔ افسانے میں ایک ایسا کردار دکھایا جارہا ہے جس نے اپنے ملک اور اپنی قوم کے لئے ڈھیروں خدمات سرانجام دی ہیں جس میں اس شخص کی قومی و ملی خدمات کے باعث اس کے مرنے کے بعد بھی اس سلسلے کو جاری رکھنے کے لئے کمیٹیاں تشکیل دی جارہی ہیں۔

''اس موقع پر خاکسار تحریک آزادی سے متعلق اپنی خاندانی خدمات کا ذکر اس لیے نہیں کرنا چاہتا کہ وہ روز روشن کی طرح عیاں ہیں اور حاسدوں کی افتراء پرداری کے باوجود خاکسار کے والد گرامی کے نام سے اس کو منسوب کیا گیا ہے۔''(۸)

''تحریک آزادی کے عظیم مجاہد اور عالم بے بدل ہیں مگر ان کی پیرانہ سالی نے ان کی سماعت اور بینائی کے ساتھ ساتھ ان کی یاداشت کو بھی دھندلا کر دیا ہے اور یہ ایک قومی المیہ ہے کہ بسا اوقات انہیں یہ بھی بھول جاتا ہے کہ وہ اجلاس میں کیوں تشریف لائے ہیں۔'' (۹)

افسانے کا وہ کردار جس نے قوم کے لیے بہت قربانیاں دیں اس کی سوانح عمری کو مرتب کرنے کے لئے غور و فکر کیا جارہاہے تاکہ اس عظیم قومی شخصیت کی سوانح عمری کو پڑھنے کے بعد لوگوں میں آزادی کا جذبہ، جدوجہد ،ایثار، صالحیت اور ریاضیت کی عظمت نقش ہو سکے۔ یہاں یہاں اس کی سیاسی اور قومی خدمات کو بیان کیا جارہا ہے۔ آزادی کے بعد صاحب زادہ مرحوم حکومت کے خیر خواہ رہے اور عملی تعاون کرتے رہے اور ہر حکومت نے ان کے اس تعاون کا بھرپور جواب بھی دیا۔

انوار احمد انصاف پسند رویے کے مالک ہیں۔ ان کے افسانوں میں انصاف پسندی کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے ۔وہ عدالتی معاملات اور دیگر ملکی معاملات میں انصاف کی بالادستی چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مساوات اور انصاف پسندی کے ساتھ ملک کو چلایا جائے۔ حکومتی معاملات میں بھی انصاف کا دور دورہ ہو۔ اگرچہ انوار احمد نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ ترکی اور جاپان میں گزارا اور وہاں رہ کر بھی انہوں نے تحریری کام جاری رکھا۔ مگر انہوں نے اپنی زندگی کے اس حصے میں بھی اپنے افسانوں اور خاکوں میں اہل وطن کو ہی مخاطب کیا۔ انوار احمد کا افسانہ ''جب راج کرے گی خلق خدا'' انقلاب اور انصاف پسند رویے پر مبنی ہے۔

انوار احمد کے اس افسانے میں اس دور کا ذکر ہے جب ایوب خان کے خلاف تحریک کا آغاز ہوا اور وہ کالج میگزین کے ایڈیٹر تھے اور ان کی طرف ایک حکم نامہ بھیجا گیا کہ اس میگزین ''نخلستان'' میں ڈکٹیٹر کے حوالے سے ایک سیکشن شامل کیا جائے۔ انہوں نے میگزین میں ڈکٹیٹر کے حوالے سے کچھ حصہ شامل کر دیا جس کی بنا پر کچھ لوگوں نے اس کی بہت سی کاپیوں کو جلا دیا اور انہی لوگوں کی جانب سے ان پر ظلم تشدد بھی کیا گیا۔ اور پھر انہوں نے اپنے حق اور انصاف کے لئے کچھ جملے ہال کی سیڑھیوں پر چڑھ کر کہے۔

''میرے غیور اور باشعور طالب علم بھائیو! میں نے تو جبر کی سنگینوں تلے صرف اس جملے کا اضافہ کیا ہے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان نے دس سال تک جو کچھ ملک میں کیا ہے وہ کسی باشعور سے مخفی نہیں۔ سو میرے غیور اور باشعور بھائیو بتاؤ کیا یہ آپ سے مخفی ہے کہ اس ڈکٹیٹر نے اس ملک کے ساتھ کیا کیا ہے؟ اچانک ہجوم نے میری پھٹی ہوئی قمیض اور سوجے ہوئے گال نظر انداز کر کے میرے حق میں نعرے لگانے شروع کر دیے۔''

(۱۰)

بھٹو کے عدالتی قتل اور اس کے بعد کی سرکاری پالیسی نے ملکی حالات میں کافی تلخی پیدا کر دی۔ جمہوریت کی بحالی ایک خواب کی مانند رہ گئی تھی کیونکہ جمہوریت کی بحالی ہی ملک میں سماجی عدل لا سکتی تھی۔

''صرف اپنے نصب العین کے حق میں میں پمفلٹ لکھیں، سیاسی لیڈر کی فکری تیاری میں کردار ادا کریں، مزدور انجمنوں سے اپنا رابطہ بڑھائیں اور عوامی سطح پر یاسیت اور خوف کے طلسم کو توڑنے کی کوشش کریں۔'' (۱۱)

افسانے کے ان سب کے کرداروں کو ایسا لگتا تھا کہ ان کے پمفلٹ کو پڑھ کے جیلر، جلاد اور ججوں کے ضمیر جاگ اٹھیں گئے۔ مگر ایسا بالکل نہیں ہوا باضمیر لوگوں کو کوڑے مارنے کی ہدایت کی گئی اور اور ان لوگوں کے منہ کے آگے مائیک رکھ کر ان کی چیخوں کو عبرت ناک بنا دیا۔ لوگوں پر اس قدر ظلم تشدد کیا گیا کہ ان کے گھروں میں گھس کر ڈاکوؤں کی مانند ماؤں اور بہنوں پر تشدد کیا گیا تھا۔ ان تمام ظلم و ستم کے باوجود افسانے کے آخری حصے

میں ایک ایسا وقت بھی آیا جب سارے خواب زندہ ہو گئے اور لوگوں کے درمیان محبت اور دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا جس سے طاقتور اور ظالم لوگ خوف کھانے لگے۔

"جب ظلم و ستم کے کوہِ گراں روئی کی طرح اڑ جائیں گے اور مظلوموں کے پاؤں تلے یہ دھرتی دھڑ دھڑ، دھڑکے گی اور اہلِ حکم کے سروں پر جب بجلی کڑ کڑ کڑ کے گی ۔" (۱۲)

افسانے کے اس حصے میں انوار احمد پر جوش ہیں کیونکہ ہر اندھیرے کے بعد روشنی ضرور ہوتی ہے۔ پھر انقلاب کی ایک لہر اٹھی انا الحق کا نعرہ لگا۔

"اور پھر خلق خدا اپنے راج کرنے کے تصور، اپنی مالی کو توقیر میں بدلنے کے خیال سے ہی مخمور ہو کر ایسے سنائی اور دکھائی دی کہ شاعر جلاوطنی کے عالم میں مغنیہ ملتان جیسے قدامت پسند شہر میں اس ترانے کی ایسی پذیرائی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔" (۱۳)

"پھر سانپ جیسی آنکھوں والے کا دور آیا اور نئے سرے سے مسلمانوں کے ختنے چیک ہونے شروع ہو گئے۔ ایک صالح جماعت نے اس حاکم کے سائے میں اخبارات ، سرکاری ملازمتوں، خاص طور پر تعلیمی اداروں میں طہارت کے بہانے کئی لوگوں پر رزق کے دروازے بند کرنے شروع کیے۔" (۱۴)

انوار احمد ترقی پسند اور روشن خیال ذہن و فکر کے مالک ہیں۔ اگر ان کو روشن خیال اور ترقی پسند ادیب کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ اس لئے ان کی تحریروں میں کرداروں کے اندر زندہ رہنے اور جدوجہد کا جذبہ موجود ہے ان کے کردار بے بسی کے خلاف جہاد کرتے نظر آتے ہیں۔ فوجی آمریت کے خلاف احتجاج کی کچھ صورتیں بعض جگہ علامتی اور بعض جگہ تحریری انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ انوار احمد نے مزاحمتی ادب کو ایک نیا زاویہ دیا ترقی پسند سوچ کو پیش کرنے کی صورت ان کے ہاں بڑی واضح نظر آتی ہے۔

انوار احمد چونکہ ترقی پسند تحریک سے متاثر دکھائی دیتے ہیں اس لئے ان کے افسانوں میں ترقی پسند رجحانات موجود ہے مگر ان کا افسانہ جدید افسانہ ہے جس میں اردو کی ایک عظیم روایت اپنے تمام رجحانات اور تحریکوں کے ساتھ موجود ہے۔ ان کے افسانوں میں غربت، جہالت، آمریت کا اثر، سیاسی منافقت، سماجی ناانصافی معاشی اور نفسیاتی الجھنیں پورے منظر کے ساتھ دکھائی دیتی ہیں ۔ترقی پسندی کے حوالے سے ان کا افسانہ ''آسٹر وٹرف'' کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ یہ افسانہ ۱۹۷۴ء میں لکھا گیا جب سقوط ڈھاکہ کے واقعات کو تین سال گزر چکے تھے ۔اس افسانے کا موضوع یوں تو معاشی سطح سے اٹھ کر مذہبی ، سیاسی ، تہذیبی اور جغرافیائی سطح تک وسیع ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں شناخت کی تلاش کا مسئلہ ، معاشی اور سیاسی جبر کے تحت اختیار کی جانے والی جلاوطنی اور عدم تحفظ کے احساس کو ایک بوڑھے متکلم کی بیانیہ خود کلامی کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔

''بلکہ یہ واقعہ ہے کہ مجھے قطعاً یاد نہیں کی اس زمین پر گھر بنانے سے پہلے میرا کوئی
اور گھر بھی تھا۔ ہاں بعض لمحوں میں کچھ چیزیں مجھے گڑبڑا دیتی ہیں، ایک لق ودق ویرا
نہ میری نگاہوں میں پھیل جاتا ہے۔ اور میں خود کو ٹھوکریں کھاتا ہوا ایک مسافر دیکھتا ہوں
، یہ سفر نجانے کہاں سے کہاں تک کا سفر کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ ایک شہر سے دوسرے
شہر تک کا سفر یا خود سے خود تک کا سفر ! مگر یہ خود سے خدا تک کا سفر ہوتا تو پھر میں خود کو ایک
اجنبی مسافر کیوں محسوس کرتا؟'' (۱۵)

انوار احمد کے افسانے ''آسٹر وٹرف '' سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انوار احمد ترقی پسند تصور بھی رکھتے ہیں۔ اسی لیے وہ افسانے کے اقتباس میں کہتے ہیں کہ مجھے یہ بالکل یاد نہیں کہ اس زمین پر پہلے بھی میرا کوئی گھر تھا وہ ماضی کو بھولا کر ترقی کی طرف گامزن ہونا چاہتے ہیں۔ انوار احمد عصری تقاضوں کو کبھی ماضی کے حوالے سے اور کبھی اس کے مدمقابل رکھ کر پرکھتے ہیں۔ گویا انوار احمد کے افسانوں میں مثبت سیاسی عناصر کو سامنے رکھتے ہوئے جو

مطالعہ کیا اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انوار احمد کس حد تک اپنے ملک کے لوگوں کے لیے سنجیدہ ہیں۔ وہ معاشرے میں انصاف اور امن کا بول بالا چاہتے ہیں۔ اور آپس کے لڑائی جھگڑوں سے نکل کر ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن دیکھنا چاہتے ہیں۔

ب۔ انوار احمد کے خاکوں میں مثبت سیاسی عناصر

جس طرح انوار احمد کے افسانوں میں مثبت سیاسی عناصر کو اہمیت حاصل ہے اسی طرح ان کے خاکوں میں بھی مثبت سیاسی عناصر واضح ہیں۔ آپ نے اپنے بزرگوں، استادوں، دوستوں اور کچھ شاگردوں کے خاکے لکھے ہیں جن کے ساتھ آپ نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ بسر کیا۔ انوار احمد نے اپنے دوستوں ،شاگردوں اور استادوں کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات کو محفوظ رکھنے کے لیے خاکے لکھنے پر غور کیا کیونکہ ان کے پاس اچھی یادوں کا ایک ذخیرہ موجود تھا اس لیے انہوں نے خود کو مصروف رکھنے کے لیے اس کام کا انتخاب کیا۔ کیوں کہ وہ جب بھی قبرستان کا رخ کرتے تو اپنے عزیزوں اور احباب کی قبروں کو دیکھتے تو ان کے اندر تنہائی اور سناٹے کا احساس پیدا ہوتا۔

> ”مگر جب قبرستان جاتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ زیادہ عزیز استاد اور احباب تو عدم آباد روانہ ہوئے ایسے میں تنہائی اور سناٹا میرے اندر گونجنے لگتا ہے، پھر میں یہ سوچتا ہوں کے اب جو دم ہے غنیمت ہے، دوسری زندگی یا نئے جنم کی تمنا کیے بغیر باقی ماندہ زندگی کو بارِ دگر گزارا جائے، اور اس کے لیے ضروری ہے کہ گزری ہوئی زندگی پر ایک جانبدرانہ ہی سہی نگاہ ڈال لی جائے۔“ (۱۶)

انوار احمد کے خاکوں میں تمام مثبت سیاسی عناصر موجود ہیں اور ان کے خاکوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ہر ایک خاکے میں انہوں نے ایک سے زیادہ سیاسی عناصر کو جگہ دی ہے مثال کے طور پر اگر ان کے خاکے کے شروع میں ناانصافی کے متعلق بات ہو رہی ہے تو اسی خاکے میں ترقی پسند کے موضوع پر بھی بحث ہوتی دکھائی دیتی

ہے ۔انوار احمد کے خاکوں میں اگر امید کے حوالے سے بات کی جائے تو انوار احمد نے ”احمد خان درانی۔۔۔خان بابا“کا جو خاکہ تحریر کیا ہے اس میں ان کے اندر حب الوطنی کے ساتھ ساتھ امید کا جذبہ بھی تھا۔احمد خان درانی ایک پٹھان تھے اور پٹھانوں کی طرح سیاسی طور پر قدامت پرستانہ خیالات کے مالک تھے۔یہ جماعت اسلامی سے وابستہ تھے اور پھر ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف تحریک میں شامل ہونے کی بنا پر ان کو جیل بھی جانا پڑا۔بھٹو کے خلاف جب تحریک میں شامل ہوئے اور گرفتار ہونے کے بعد ان کو جیل کی سختیوں کا سامنا کرنا پڑا ان کو اس بنا پر جیل والوں نے رہا کیا کہ وہ سپریٹنڈنٹ جیل کی مبینہ زیادتیوں کو خوب پھیلائیں۔اسی دوران جب ان کا ایک سفر نامہ شائع ہوا تو اس میں انہوں نے ظلم اور مظلوم کے بارے میں کہا ”ظالم مکتی باہنی والوں نے مظلوم بہاریوں کو بندوق سے تہہ تیغ کر دیا۔“ (۱۷)

خان بابا کراچی سے ملتان کا سفر کر رہے تھے کہ ان کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا مگر وہ اس حادثے میں محفوظ رہے ۔حادثے میں بچ جانے پر انہیں امید تھی کہ اللہ تعالی نے ان سے کوئی بہت اہم کام لینا ہے۔اللہ تعالی نے ان کو ان کے بچوں اور دوستوں کے لیے زندہ رکھا ہے کیونکہ وہ ان کے لئے ایک امید تھے۔

> ”اللہ نے آپ کو محض اپنے دوستوں اور بچوں کے لئے زندہ رکھا ہے کہ آپ ان میں نہ صرف چہکتے رہیں بلکہ انہیں اچھے کھانوں اور باتوں کے ذائقے سے بھی آشنا رکھیں اور بلاشبہ اس حوالے سے ان کا دل بہت بڑا تھا۔“ (۱۸)

احمد خان درانی کئی انجمنوں اور اداروں کے لئے ایک امید تھے ملتان میں ایک کتاب کی تعارفی تقریب میں آپ نے شرکت کی تو حسب روایت ضیاء الحق کے بارے میں لطائف اور فقرہ بازی کا بازار گرم ہوا اور شرکاء میں سے کچھ ضیاء الحق کے مخصوص سٹائل میں ادا کیے جانے والے جملوں کی نقل بازی کر رہے تھے۔احمد خان چونکہ ضیاء الحق کے حمایتی تھے اور انہوں نے ضیاء الحق کا امید بھرا ایک جملہ شرکاء کے سامنے بیان کیا اور کہا کہ تمہارے ٹی وی میں کوئی خرابی ہو گئی۔

"ضیاء الحق نے کیہان انٹر نیشنل کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان کو ذہانت کی

نہیں، حب وطن کی ضرورت ہے، اس سے جہاں بھٹو کے حوالے سے اس کا احساس

کمتری ظاہر ہوتا ہے، وہاں اس کا ساتھ دینے والوں کی ذہنی سطح کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔" (۱۹)

خان بابا کینسر کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ ناولوں اور ڈراموں کی طرح سب کی آنکھوں میں تنہائی، افسردگی اور ملال کا منظر اترنے لگا۔ لیکن مرنے سے پہلے انہوں نے اپنی سب سے بڑی تمنا یا امید کو پایا تکمیل تک پہنچایا اولاد کو جائیداد کے تنازعے سے نکالا۔ خان بابا اخلاص، حسین مزاج اور زندگی کی امنگ سے لبریز تھے وہ ایک ایسی ذہانت کے مالک تھے کہ جن کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے باقی لوگوں کے اندر بھی ایک امید کی کرن جاگ اٹھتی ہے۔

جس طرح انوار احمد کے افسانوں میں انصاف پسندی کا عنصر نمایاں ہے اسی طرح ان کے خاکوں میں بھی انصاف پسندی کو اہمیت حاصل ہے۔ انوار احمد اپنی محبوب شخصیت پروفیسر خلیل صدیقی کا خاکہ لکھتے ہیں آپ نے یہ خاکہ "پروفیسر خلیل صدیقی !میری محبوب شخصیت" کے عنوان سے تحریر کیا۔ پروفیسر خلیل صدیقی محقق، نقاد، ماہر لسانیات، استاد اور ایک شاعر تھے۔ پاکستان کی وزیر اعظم بے نظیر بھٹو اور اس وقت کے نواب اکبر علی بگٹی کے درمیان ۱۹۷۳ء کے آئین کے حوالے سے جو خط و کتابت ہوئی اس کا ڈرافٹ پروفیسر خلیل صدیقی نے ہی کیا۔ پروفیسر صاحب جب بھی کوئی تاریخی مراسلہ نواب اکبر خان بگٹی کے کہنے پر تحریر کرتے تو اس کو انتہائی خفیہ رکھتے۔ انوار احمد نے پروفیسر خلیل صدیقی کے ساتھ رہ کر مشاہدہ کیا کہ وہ حق گوئی اور انصاف پسندی سے کام لیتے ہیں جس کے باعث ان کو بلوچ بھی پسند کرتے تھے۔

"میں ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۲ء کہ برسوں میں ان کے ساتھ متواتر رہ کر مشاہدہ کیا کہ وہ

کرسیوں سے محبت والوں کی طرح بااختیار لوگوں کی خوشامد نہیں کرتے تھے، اور نہ

ہی کسی اتھارٹی سے خوفزدہ ہوتے تھے، انہیں بلوچ حق گوئی بلکہ تلخ نوائی کے سبب پسند
کرتے تھے۔" (۲۰)

۱۹۷۷ء میں جب ضیاء الحق کے مارشل لاء کا آغاز ہوا تو پروفیسر خلیل صدیقی کو اپنی زندگی کے سب سے بدترین دور کا سامنا کرنا پڑا آپ ڈائریکٹر تعلیمات کے عہدے پر مامور تھے اور حق گوئی کے ساتھ اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ دو نمبر بر گیڈیئر کی بیوی گورنمنٹ گرلز کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تھی اور اپنے سینئر اساتذہ سے پہلے پروموشن کی خواہشمند تھی مگر خلیل صدیقی نے انصاف پسندی کو ملحوظ خاطر رکھا اور اس کی پروموشن کرنے سے انکار کر دیا جس کی بنا پر ان پر بے ضابطگی اور بدعنوانی کا الزام لگا کر معطل کرا دیا گیا۔

"صدیقی صاحب نے کہا، دیکھو میاں! پروموشن کوئی پڑیا تو ہے نہیں، اور نہ یہ پرچون کی دکان ہے کہ میں آپ کو باندھ کر دے دوں، تب سارے ملک کے تعلیمی حلقوں میں ایک نا قابل یقین خبر سنی گئی کہ پروفیسر خلیل صدیقی کو بدعنوانی اور بے ضابطگی پر معطل کر دیا گیا ہے۔" (۲۱)

خلیل صدیقی کے انصاف پسند رویے پر ان پر ہندوستانی ہونے کا الزام لگایا گیا اور کہا گیا کہ کچھ لوگوں سے رشوت لے کر انہیں پرموشن دے دی گئی۔ پروفیسر خلیل صدیقی کے حمایتی ان سے کان میں آکر آہستہ سے کہتے کہ یہ شخصی فوجی نظام ہے۔ انوار احمد نے کچھ سفارشی خط فوجی افسروں کے نام خلیل صدیقی کی حمایت میں لکھے اور جب خلیل صدیقی کو انوار احمد کی طرف سے لکھے جانے والے سفارش خطوط کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ تم نے خوب راہ نکالی ہے کہ تم ان افسروں کے در پر سوالی بن گئے۔ لیکن خلیل صدیقی نے اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی کے آگے ہار نہیں مانی اور اپنا مقدمہ خود لڑا اور اپنے اوپر لگائے جانے والے الزامات سے باعزت بری ہوئے اور انہیں انصاف ملا۔ خلیل صدیقی نے مشکل ترین لمحات میں بدترین خود پسندوں کے سامنے سچ اور حق کی بات کی اور انصاف پسندی سے کام لیا اور جہاں کچھ غلط ہوتا ہوا دیکھا اس کے خلاف اپنی آواز کا پرچم بلند کیا۔

" جس معاشرے میں جج سے لے کر جلاد تک اپنی اولاد کو نائب تحصیلدار بنوا کر کامرانی سے سرشار ہوتے ہیں وہاں متوسط طبقے کی غرض مندی، خوشامد، خوف اور حرص کا ایک ایسا جالا بنتی ہے کہ عالم و دانشور کہلانے کا شائق اس میں الٹا لٹکا رہتا ہے کہ اسے قلابازیاں کھانے میں سہولت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جس منافقت، موقع پرستی اور خود غرضی کا رونا رویا جاتا ہے اسے فروغ دینے میں ہمارے علماء و دانشور حضرات کا بہت بڑا کردار ہے۔" (۲۲)

انوار احمد کے اس خاکے میں انصاف پسندی کے ساتھ ایک امید بھی ہے خلیل صدیقی کہتے ہیں کہ لوگ اپنی ذات پات اور رنگ و نسل اور زبان کو پہچان کا وسیلہ خیال کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ فطرت کے جبر پر کیا فخر کرنا اپنی حلال روزی پر فخر کرو محنت اور ریاضت پر فخر کرو لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک رکھو جس میں اپنائیت یا اجتماعی احساس پیدا ہو اور ان کا مزید کہنا تھا کہ جتنی بھی مشکلات آئیں مگر اپنے ہاتھ میں امید کے چراغ کو تھامے رکھو اور آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ ان کے خیال میں انسان کو خود پر غور کرنا چاہیے کہ اگر وہ اونچے عہدوں پر فائز رہا ہے تو اس کا کیا مقصد تھا اور اس نے معاشرے کے لیے کیا کیا۔

انوار احمد نے بے نظیر بھٹو کی شخصیت اور ملکی خدمات پر جو خاکہ تحریر کیا ہے اس کا عنوان "بے نظیر بھٹو سے حلقِ خدا کا انمٹ لگاؤ" ہے۔ بے نظیر بھٹو انوار احمد کی پسندیدہ سیاسی شخصیت تھیں۔ انوار احمد کے اس خاکے میں پُر امیدی، مزاحمت، بدعنوانی اور جبر و تشدد جیسے عناصر ملتے ہیں۔ یہاں انوار احمد نے سماجی، سیاسی اور معاشی نظام کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ انوار احمد کا خیال ہے کہ جو اچھے سیاسی لیڈر ہوتے ہیں انہیں زیادہ دیر تک کامیاب نہیں ہونے دیا جاتا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے عدالتی قتل کے بعد جب انوار احمد دیگر لوگوں کے ساتھ یحییٰ بختیار کے بنگلے میں بے نظیر اور نصرت بھٹو سے تعزیت کے لیے گئے تو وہاں جا کر تو انہوں نے سوچا عسکری نظام

حکومت نے کس طرح عوام کی امیدوں اور امنگوں کو کچل کر رکھ دیا ہے۔ اور اب عوام نے بے نظیر بھٹو سے امیدیں لگائی ہوئی تھیں۔

"عسکری ڈکٹیٹروں اور ایجنسیوں نے پاکستانی عوام کے خوابوں اور امنگوں کو

جس بے رحمی سے کچلا ہے اس کے ملبے میں دبے ہوئے نہتے لوگوں نے اس لڑکی

سے نظام کو بدلنے کی جو توقع قائم کر رکھی ہے کیا وہ پوری ہو گی؟" (۲۳)

آمرانہ نظام حکومت کے زخم سہنے والوں کی توقعات لامحدود تھیں اور عوام بے نظیر بھٹو پر امیدیں لگائے بیٹھے تھے کہ شاید اس کی حکومت آنے پر ان کو تمام مشکلات اور مسائل سے چھٹکارا مل جائے گا کیونکہ عسکری حکومت کے تحت باقی سیاستدانوں کو بدعنوان اور جھگڑالو ثابت کر کے پھر وردی میں ملبوس ہو کر پاکستانی عوام سے اگلے دس برس کے عرصے پر محیط ایک ہی خطاب کیا جاتا تھا کہ ہمارے عزیز ہم وطنو ہم نے آپ کو جمہوریت اور سیاست کے فریب اور بدعنوانی کے چنگل سے آزاد کر کے آپ پر براہ راست ایک خوشگوار حکومت کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ بے نظیر بھٹو پر بہت سے الزامات لگا کر ان کو وزارت عظمیٰ سے محروم کر دیا اور ان کو ان الزامات کی بنا پر مقدمات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ یہاں انوار احمد کے خاکے میں پارٹی کے شیدائیوں اور عوام کی طرف سے مزاحمت کا عنصر بھی نمایاں ہے۔

"میں نے دو ایک صفحے پڑھے جو شاید اتنے اہم نہیں تھے مگر پارٹی کے شیدائیوں

میں جو غم و غصہ تھا اس کی بدولت میری اس تقریر کو کافی پذیرائی ملی اور جب

میں واپس آیا تو بے نظیر نے بھی کہا کہ آپ نے ایک تقریر میرے لیے بھی

لکھنی ہے۔" (۲۴)

انوار احمد نے بے نظیر بھٹو سے ملتان میں ایک ملاقات کے دوران کہا کہ ملتان میں روشن خیالی کے متعلق ضیاء الحق کے زمانے میں بعض اساتذہ، ادیبوں، دانشوروں اور وکیلوں نے بہت اہم کردار ادا کیے اور امروز اخبار کے

متعلق بات کی کہ ضیاء الحق کے زمانے میں جب اس اخبار کی اشاعت روک دی گئی تھی تو آپ نے اس اخبار کی دوبارہ اشاعت کے متعلق سوچا ہی نہیں۔ اور نہ ہی ملتان میں روشن خیالی کے بند ہو جانے والے دروازے پر غور و فکر کیا۔ بے نظیر بھٹو کو بد عنوانی کے الزامات کے تحت ان کی اپنی جماعت کے صدر نے برطرف کر دیا آصف زرداری کو جیل میں ڈال دیا گیا اور بے نظیر بھٹو کو ملک بدر کر دیا اور بے نظیر کے کچھ اہم درد دانشوروں نے ان کے خلاف لکھنا شروع کر دیا۔

"بے نظیر بھٹو کو راستے سے ہٹا دیا جائے گا اور اس ملک میں نظام کے بدلے کی تمنا رکھنے والے بے روزگار نوجوانوں اور فاقہ کش مزدوروں اور زمین سے محروم کسانوں کی امید کو چھین لیا جائے گا۔ " (۲۵)

بے نظیر بھٹو کے متعلق عوام کو امید تھی کہ اپنے وطن میں خوشحالی اور مساوات کی راہ ہموار کرے گی۔ عوام کے چہرے پر ایک خوشی اور امید رقصاں تھی لیکن کچھ لوگ بے نظیر کی سیاسی بصیرت کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے خطاب کے چند جملے جو طاقت کے متعلق ہیں کہ عوام پر سیاسی طاقت کو آزمانہ نہیں چاہیے۔

"طاقت سے میری مراد ہے وہ چیز جس سے آپ پہاڑوں کو گرا کر زمین کو برابر کرتے ہیں جن سے صحراؤں میں پھول کھلتے ہیں اور ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیتے ہیں، جہاں بھوک اور ذلت سے کوئی نہیں مرتا، می ڈکٹیٹر نہیں بننا چاہتا لیکن میں ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں کو دوبارہ جوڑنے کی کوشش کر رہا ہوں وہ کرچیوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ "

(۲۶)

انوار احمد کے خاکوں میں ایک عنصر ترقی پسندی بھی قابل ذکر ہے۔ اس حوالے سے انوار احمد نے "حمید اختر سپاہ دانش کا بہادر سپاہی " کے عنوان سے جو خاکہ تحریر کیا ہے اس میں ترقی پسندی کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ۔ انوار احمد کہتے ہیں کہ کچھ لوگ آمریت کے نظام حکومت کو بری نظر سے دیکھتے ہیں لیکن آمریت نے اپنے

جبر سے ترقی پسند تحریک کو پاکستان میں تقویت بخشی اور ہم آمرانہ نظام پاکستان کے اس کارنامے کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ایوب خان کی حکومت کے زوال کے ساتھ ہی سیاست، معشیت تاریخ اور خارجہ تعلقات کے حوالے سے سوال اٹھائے جانے لگے تھے۔ اس کے بعد جب ضیاء الحق کا دور آیا تو بھٹو سے دشمنی کی بنا پر ضیاء حکومت نے سندھ، سرحد اور بلوچستان میں ترقی پسند قوم پرستوں کو بٹھالیا اور مذہب کے نام پر پورے پنجاب کے تعلیمی نظام کو جماعت اسلامی کے حوالے کر دیا۔

> ''ضیاء کے دور میں ہی ترقی پسند اور روشن خیال اساتذہ اور طالب علموں کو جس
> طرح شاہی قلعے، جیل، تفتیش اور دور دراز مقامات کے تبادلے اور صالحین کے فتوؤں
> کا سامنا کرنا پڑا اس سے ہماری نسل کے لوگوں کو ترقی پسند دانشوروں، صحافیوں اور
> کارکنوں سے از سر نو متعارف ہونے کا موقع ملا۔'' (۲۷)

ضیاء الحق کے دور حکومت میں روشن خیال اور ترقی پسند طالبعلموں اور اساتذہ کو جیل کی ہوا کھانی پڑی اور ان کے تبادلے دور دراز علاقوں میں کر دیے گئے ضیاء الحق کے زمانے میں روشن فکر ''امروز'' کا دروازہ بھی ڈولنے لگا۔ ایسے بدترین اور ظلمات کے دور میں وہ ادیب جن کا تعلق ترقی پسند تحریک سے تھا وہ بھی تلخ سوال سن کر کوشش کرتے تھے کہ محبت کو وعدے کی پاسداری اور امید کا مظہر بنا دیں۔ انوار احمد کو حمید اختر جیسے بہادر سپاہی پر فخر تھا کیونکہ حمید اختر نے ضیاء الحق کے دور حکومت میں جیل میں ڈالے جانے والے قیدیوں کی دادرسی کے لئے خاطر خواہ انتظامات کئے اور ان کے لئے قابل قدر تجاویز بھی پیش کیں۔ انوار احمد کا کہنا تھا کہ دنیا سے جانا کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن ایک بہادر سپاہی کا منظر سے ہٹنا سپاہ دانش کے دل کو ہلا تو دیتا ہے۔

انوار احمد نے ''میری زندگی میں آنے والے چند اور یادگار لوگ'' کے عنوان سے چند لوگوں کے جو خاکے لکھے ان میں ایک خاکہ ''اپنے شاہ جی'' کے عنوان سے ہے جس میں ترقی پسندی کے ساتھ مزاحمت کا عنصر بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ ہمارے ملک میں ہر دس سالوں کے بعد ایک ایسا وقت آتا ہے جب اجتماعی بقا کے حوالے

سے سوالات اٹھائے جاتے ہیں۔ جس میں کوئی معاشرے کے خود کفیل ہونے، ریاستی اداروں کے منظم اور مربوط ہونے اور سیاسی نظام اور نئے قانون کی بات کر رہا ہوتا ہے۔ لیکن یہ سوالات درس گاہوں اور تعلیمی اداروں کی بجائے میڈیا اور دھرنوں میں ہی زیر بحث ہیں۔ عسکری نظام حکومت میں ادیبوں اور اساتذہ کو زبان بندی اور رزق کی بندشوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اور قاتلوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ان ڈاکٹروں، استادوں اور ادیبوں کو قتل کر دیں جو حسن اخلاق اور انصاف کی بات کرتے ہیں۔

> "ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی، محسن نقوی اور بے نظیر کے قتل کے بعد میری زندگی کے سانحات میں سید شبیر شاہ کا قتل بھلائے نہیں بھولتا۔ یہاں کوئی دوست کہہ بھی سکتا ہے کہ آخر کیوں بھلا دیا جائے کہ صرف گجرات کا نہیں پاکستان کا بلکہ انسانیت کا سرمایہ صبح کے وقت یونیورسٹی جاتے ہوئے اس طرح گولیوں کا نشانہ بنایا گیا کہ مجسم سوال بنی لاش کئی گھنٹے سڑک پر پڑی رہی؟" (۲۸)

انوار احمد کے خیال میں خود غرضی سے جینے کی بجائے دوسروں کے لئے جینا چاہیے کیونکہ اس سے معاشرے میں رواداری اور مروت بڑھ جاتی ہے اور امید کا دیا روشن ہوتا ہے۔ اور امید ہوتی ہے کہ تشدد اور تعصب کی لپیٹ میں آیا معاشرہ شاید کبھی امن کا سانس لے سکے۔ اس خاکے میں شاہ جی کے قتل پر انوار احمد انتہائی غمگین نظر آتے ہیں شاہ جی چونکہ ایک روشن خیال ذہن رکھنے والے انسان تھے جن کو ایک سازش کے تحت قتل کر دیا گیا تھا۔

انوار احمد نے حسن رضا گردیزی کا جو خاکہ تحریر کیا اس میں بھی مزاحمتی رویہ نمایاں ہے سید حسن رضا گردیزی ایک تخلیق کار تھے اور ان کا تعلق ملتان سے تھا۔ وہ توہمات، ضعیف الاعتقادی اور جہالت جیسی قوتوں کے خلاف مزاحمت کرتے رہے۔ ضیاء الحق کے دور میں ان کے تخلیقی فقرے پاکستان میں فکری مزاحمت کی تاریخ کا ایک روشن باب ہیں سید حسن رضا گردیزی کی شخصیت میں ہمدردی کا جذبہ تھا وہ مجبور اور محرومی کے مارے

ہوئے لوگوں کی وجہ سے پیدا ہوا۔ آزادی فکر اور آزادی اظہار کو ترسنے والوں کے لئے حسن رضا گردیزی کے تخلیقی جملے جذباتی اور فکری آسرا بنتے ہیں۔ تشدد سے پُر قومی منظر نامے کی پیشگوئی حسن رضا گردیزی نے بہت پہلے کر دی تھی۔

انوار احمد نے عرش صدیقی کے نام جو خاکے تحریر کیا اس خاکے میں حب الوطنی اور آزادی کا جذبہ موجود ہے ۔انوار احمد نے یہ خاکہ "عرش صدیقی شعور و ادراک کے پرچار جذباتی انسان "کے عنوان سے لکھا۔ عرش صدیقی چونکہ جذباتی انسان تھے وہ تنہائی ،بے وفائی اور بالا دستی سے ڈرتے تھے۔ عرش صدیقی روشن خیال ،سائنسی شعور اور اخلاقی اقدار کے خوبصورت جذبات کے مالک تھے۔

"زیادہ دردناک یہ کہ مارشل لاء کے سائے میں ،جماعت اسلامی کے ایک متفق ،خان بابا احمد درانی کی وسعت سے ملتان کے ایک صالح، پرچون فروش کے سامنے اپنے نظریات کی وضاحتیں کرتے اور حب وطن اور اسلام سے وفاداری کے دستاویزی ثبوت پیش کرتے دیکھا۔ " (۲۹)

ہر تحریک، فکر اور باشعور انسان کی موافقت کے ساتھ ساتھ مخالفت بھی ضرور ہوتی ہے اور عرش صدیقی بھی اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ ان کی لوگوں نے مخالفت بھی بہت ہیں اور ان کو عزت و احترام بھی خوب دیا۔ لیکن وہ ایک لبرل اور روشن خیال انسان تھے۔ ملتان یونیورسٹی کا نام تبدیل کر کے بہاؤا لدین زکریا یونیورسٹی کرنے کی تقریب میں بیکری کے کیک کے باعث کئی شرکاء کو رات ہسپتال میں گزارنی پڑی اور اس کا الزام بھی عرش صدیقی کے سر آیا کہ انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دینے کا بدلہ لینے کے لئے کیک میں زہر ملا دیا ہے۔ ایک جگہ عرش صدیقی آزادی اظہار کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"ہم نے یہ ثابت کرنا چاہا کہ خط کے محرک بھی وہی آئیڈیلز ہیں جو خود انہیں عزیز رہے ہیں اور انہوں نے بھی یہ واضح کرنا چاہا کہ سرکاری ملازمت اور آزادی اظہار دو الگ معاملات ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے رسید دکھا کر ثابت کرنا چاہتے

مولانا مودودی کی تفسیر کی تمام جلدیں انہوں نے ضیاء الحق کی طرح بھٹو دور میں ہی

خرید لی تھیں۔ " (۳۰)

عرش صدیقی خود اخلاقی نظم و ضبط کے بے حد قائل تھے لیکن ان کے مخالف لوگ ان جیسے لبرل اور روشن خیال کو کیا کیا القاب دیتے تھے عرش صدیقی نے اردو میں غزلیں، نظمیں، افسانے، دوہے اور مضمون وغیرہ لکھے۔ انگریزی زبان و ادب کے مطالعے نے ان کی ذہنی اور تہذیبی کائنات میں وسعت پیدا کی۔ عرش صدیقی ایک حساس اور خود پسند شخصیت کے مالک تھے۔ اپنا بوجھ حکومت یا دوسروں پر ڈالنے کے قائل نہیں تھے بلکہ آزاد رہ کر آزادی کی زندگی گزارنے کی خواہاں تھے اور ایسا ہی کیا۔ نظم ضبط، توازن، دیانت، محنت، انسان دوستی نے انہیں غیر معمولی انسان اور استاد بنایا اور علم کے امتزاج نے انہیں ہر عمر اور ہر طبقے کے لوگوں میں عزت دی۔

انوار احمد نے اپنے نانا کی شخصیت پر جو خاکہ تحریر کیا اس میں بھی کہیں کہیں احتجاجی عنصر بھی نظر آتا ہے۔ انوار احمد کے نانا اور ان کی دادی کے درمیان سیاسی اور ثقافتی کشیدگی زیادہ نظر آتی ہے۔ انوار احمد نے اپنے نانا کے نام "حضرت جی۔۔۔ بنام حسین بخش" کے عنوان سے خاکہ تحریر کیا۔ انوار احمد اپنے نانا کی شفقت اور محبت کا ذکر بھی اس خاکے میں کرتے ہیں لیکن وہ اپنے نانا کے حوالے سے یہ بھی کہتے ہیں کہ انہوں نے شروع سے ہی احتجاج کا مظاہرہ کیا اور ہمیشہ احتجاجی اشتہار ہی لکھے۔

"اپنے بچپن سے ہی میں نے انہیں احتجاجی اشتہار لکھتے دیکھا، میرے نانا کے والد

حاجی برخوردنے شاہد قاضی مٹھو کی خانقاہ بنوائی تھی ہمارے نانا اس خانقاہ کے متولی

کے خلاف تھے کافی سارے گدی نشیں اور متولی قبرستان وقف املاک بیچ رہے تھے نانا

جی کے بیشتر اشتہار انہی کے خلاف تھے۔ " (۳۱)

یہاں انوار احمد کے نانا جب بھی گورنر اور وزیر اعلی کی آمد ہوتی تو اپنے تین چار خبطی رفقائے کار کے ساتھ احتجاجی مظاہرہ کرتے اور ایک مرتبہ وہ وزیر اعلٰی مغربی پاکستان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ کیوں کہ وہ احتجاج قبرستان کے متوالے کے خلاف کرتے تھے اس لئے وزیر اعلی کو قبرستانوں اور مزاروں پر اپنے ساتھ لے گئے میرے نانا جو ساری عمر احتجاجی مظاہرہ کرتے رہے مگر اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اپنے بیٹے کی طرف سے خرچہ نہ بھجوانے پر کبھی انہوں نے احتجاجی رویہ اختیار نہ کیا۔ اور زندگی میں وہ قبرستان کے تحفظ کے لیے جنگ لڑتے رہے تھے اور اپنے کفن کے انتظام کے ساتھ ساتھ اپنی قبر بھی کھدوا کر رکھی تھی۔

انوار احمد کے افسانوں کا دورانیہ ۱۹۷۲ سے ۲۰۰۹ تک کا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے افسانے ہماری سیاسی و معاشرتی تاریخ کا بھرپور احاطہ کرتے ہیں۔ ہم جوں جوں ان کی کتابوں کے اوراق کو پلٹتے ہیں تو ان کی تخلیق کاری کا حسن نکھارتا چلا جاتا ہے۔ انوار احمد حقیقت پسندی کے حامی ہیں اور ان کے بیانات روشن خیالی کی اوڑھنی اوڑھے ہوئے ہیں۔ اور ترقی پسند فکر ان کے ہر افسانے میں عیاں ہے۔ ان کے افسانوں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ان کا معاشرتی مطالعہ بہت وسیع ہے۔ انہوں نے لفظوں کو تخلیقی سطح پر استعمال کر کے آئے دن کے تجربات میں ابلاغ بھر دیا ہے۔ انہیں اس بات کا اچھے سے ادراک ہے کہ بات کی ترسیل کے لیے کون سا طریقہ اختیار کرنا ہے۔ انوار احمد نے پہلی کہانی تب لکھی جب وہ کالج میں پہلے سال کے طالب علم تھے انھوں نے پہلی کہانی کا عنوان اگاتھا کرسٹی کے ایک جاسوسی ناول سے لیا تھا۔

انوار احمد پہلی کہانی لکھنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ جو انسان زندگی اور دنیا کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر مایوس ہو چکے ہیں ان میں ایک امید یا آس کو جگانا تھا۔ بھٹو کی پھانسی اور ضیا الحق دور کی بندشوں نے انوار احمد کے لیے کہانی کو ان کا جذباتی رفیق بنا دیا ان کی کہانیوں اور شعروں سے سجے پمفلٹ سے امریکی منشا سے منسلک ہمارے فوج کی بندوقوں کا رخ اور جج کے قلم کا تیور بدل سکتا ہے۔ انوار احمد اپنے افسانوں میں کہیں مزاحمت اور کہیں احتجاج

کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک ہی کہانی افسانے میں انوار احمد ایک بستی کی کہانی بیان کرتے ہیں جس میں سمندر کی طوفانی لہریں ارد گرد کی بستیوں کو نگل رہی ہیں۔ اور لوگ جو سمندر کا لقمہ بننے کی بجائے ساحل کو محفوظ جان کر اپنی قبریں خود ہی کھود رہے ہیں کیونکہ انہیں ہر طرف اندھیرا ہی نظر آ رہا تھا ایک طرف رات تھی اور دوسری طرف سمندر وہ لوگ اپنے آپ کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہی محسوس کر رہے تھے تو اس لیے انھوں نے سمندر میں ڈوب جانے کی بجائے ساحل پر اپنی قبر کھودنے کو ترجیح دیں۔ یعنی کہ مزاحمتی رویہ اختیار کیا۔ انوار احمد ان کہانیوں کو اپنے عہد کے سیاسی دور سے جوڑنے کی کوشش کی۔

انوار احمد نے جس جگہ دیکھا کہ مزاحمت یا احتجاج کھلے عام نہیں ہو سکتا تو وہاں پر انہوں نے علامتی اور استعاراتی انداز اپنایا۔ گونگی غراہٹ افسانے میں ایک فقیر جو کہ سکے لینے کی بجائے احتجاجی رویہ اختیار کرتا ہے اور سکے لے کر نالے میں پھینک دیتا ہے اس کو صاف شفاف سکے چاہیے ہوتے ہیں جب کہ وہ سکے حاجی خواجہ کی تے سے چن کر اس فقیر کو دیتا ہے فقیر تو فقیر اس افسانے کا مرکزی کردار خود بھی ظلم و ستم کے خلاف احتجاج کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور افسانے کے باقی کرداروں کو بھی احتجاجی رویہ اپنانے پر اکساتا ہے۔ چاہتا ہے کہ ہر کوئی اپنے حق کے لیے آواز بلند کریں دراصل انوار احمد یہاں پر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ظلم و ستم اور جبر تشدد کرنے والی حکومت اور حکمرانوں کے خلاف احتجاج کرنا ضروری ہے نہ کہ خاموشی سے بیٹھ کر ظلم و تشدد کو برداشت کیا جائے۔

انوار احمد کے افسانوں میں امید جیسا عنصر سے بھی قابل ذکر ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ جبر و تشدد کے خلاف امید ہی وہ واحد چیز ہے حوصلہ و ہمت پیدا کرتی ہے وہ مزید کہتے ہیں کہ امید کے آگے نفرت اور سازشوں کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ انوار احمد کہانیوں میں بھی امید کا جذبہ لے کر ایک نئی دنیا کی تلاش میں نکل جاتے ہیں انھیں نئی سے نئی چیزوں کا سراغ لگانے میں دلچسپی ہے۔ نت نئی تبدیلیوں کا مشاہدہ کرتے ہیں اور کسی روز اچانک ابھرنے والے ستارے کا انتظار کرتے ہیں اور کسی حد تک تو وہ انسانی زندگی کے آثار تلاش کرنے میں کامیاب بھی ہوئے

ہیں۔ انوار احمد نے اکثر جگہوں پر طے شدہ راستوں اور زاویوں سے ہٹ کر اپنی مرضی سے چاروں طرف نگائیں ڈورائیں۔ وہ معصوم انسانوں پر ہونے والے ظلم و تشدد سے تلملا اٹھتے ہیں۔ انوار احمد آزادی کے دلدادہ ہیں وہ چاہتے ہیں کہ انسان کو آزاد رہ کر اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے اس لیے نہ تو حکومتی نمائندے اور نہ اور کوئی ان پر زبردستی مسلط کر سکتا ہے۔ اس لیے انوار احمد کا ایک پورا افسانہ تحریک آزادی کے حوالے سے ہے یعنی اس افسانے کا مقصد ہی تحریک آزادی کو بیان کرنا ہے۔

نا قابل اشاعت افسانے میں بھی انوار احمد نے آزادی کی تحریک کو بیان کیا ہے اس افسانے میں بھی قومی مفاد سے مرتب کی جانے والی رپورٹ کو انتہائی خفیہ اور نظریاتی استحکام کی خاطر رپورٹ کو شائع کرنے سے گریز کیا گیا اور اس میں رپورٹ کو شائع ہونے سے اس لیے گریز کیا گیا کیونکہ ہماری نئی نسل جو پہلے ہی افسوسناک حد تک فکر و نظر کی یکجائی سے محروم ہے مزید ذہنی اور جذباتی انتشار کا شکار نہ ہو جائے۔ اس افسانے میں بیں صاحبزادہ مرحوم کی سیاسی و قومی خدمات کو بیان کیا جارہا ہے جس طرح افسانوں میں انوار احمد نے مثبت سیاسی عناصر کو جگہ دی بالکل اسی طرح ان کے خاکوں میں مثبت سیاسی عناصر نظر آتے ہیں۔ خاکہ نگاری ایک فن ہے جس میں کسی بھی انسان کی تصویر لفظوں سے بنائی جاتی ہے یہ ایک بولتی ہوئی تصویر ہے جو کہ ایک حقیقی انسان کی طرح اچھائی اور برائی دونوں طرح کے پہلو اپنے اندر رکھے ہوئے ہوتی ہے۔ کسی بھی شخصیت کا احاطہ تحریر کرنا ایک مشکل کام ہے اور خاکہ نگاری کا فن ہے کسی کے پاس نہیں ہوتا ہے اردو ادب میں اگر خاکہ نگاری کے فن کی روایت کو دیکھا جائے تو اس کے ابتدائی خدوخال شعرا کے تذکروں میں دکھائی دیتے ہیں۔ خاکہ نگاری سے ان شخصیات کے بارے میں آگاہی حاصل ہوتی ہے جن کو ہم جاننا چاہتے ہیں خاکہ تحریر کرنے کے لیے خاکہ نگار کسی بھی شخصیت کا انتخاب کرتا ہے۔ خاکہ لکھنے والے پر بہت سی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں کیونکہ خاکے میں جس بھی شخص کا خاکہ تحریر کیا جارہا ہو اس شخصیت کا بیان غیر جانبداری سے کیا جائے اس میں کسی بھی قسم کی دشمنی

یا دوستی کا عنصر موجود نہ ہو۔ اگر کسی کی اچھائی بیان کی جارہی ہے تو اس کے ساتھ اس شخص میں کوئی برائی ہے تو اس کو بھی بیان کرنا چاہیے۔

اسی طرح انوار احمد کی خاکوں پر مبنی کتاب یاد گار زمانہ ہے جو لوگ یہ کتاب مختلف شخصیات کے خاکوں پر مشتمل ہے انوار احمد نے جن شخصیات کے خاکے تحریر کیے ان میں ان کے دوست استاد شاگرد اور قریبی رشتہ دار شامل ہیں۔ انوار احمد کے خاکے آپ بیتیوں کی طرح کے ہیں ان کے خاکے کہانی کی طرح کے ہیں ان کے ہاں ایک خاکے میں ایک سے زیادہ شخصیات کا ذکر ملتا ہے ان کی اس کتاب میں شخصیات کا بیان کم بلکہ ان سے جڑے چند واقعات کا بیان زیادہ ہے۔ انوار احمد سچ لکھنے کی ہمت رکھتے ہیں اور کبھی کبھی وہ کہتے ہیں کہ میرے اس سچ کو کوئی میری کم ظرفی ہی نہ سمجھ بیٹھے اور کوئی مجھے خود غرض ہی نہ کہہ دے اس لیے انہوں نے اپنے بزرگوں، دوستوں اور استادوں کے خاکے لکھے جن کے ساتھ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ گزارا کیونکہ اگر ان سے اختلاف ہوا تو تعلق کا احساس باقی رہتا تھا۔ یہاں نے یہ خاکے اپنے دوستوں، بزرگوں اور استادوں کی محبت میں لکھے جو اس دنیا سے جا چکے تھے۔ انوار احمد کے زیادہ دوست، احباب، استاد اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے ان میں تنہائی اور سناٹا گونجنے لگتا ہے ان خاکوں میں انہوں نے اپنی زندگی میں پیش آنے والے حالات و واقعات کو خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ انوار احمد، ڈاکٹر، ایک ہی کہانی، پہلے سے سنی ہوئی کہانی، بیکن ہاؤس ملتان ۲۰۰۴ء، ص ۵۲

۲۔ ایضاً، ص ۵۱

۳۔ ایضاً، ص ۵۴

۴۔ اصغر ندیم، سید، کہانی کار کہانی کی کہانی، پہلے سے سنی ہوئی کہانی، بیکن بکس ملتان، ص ۲۰۰۳ء، ص ۲۰

۵۔ انوار احمد، ڈاکٹر، گونگی غراہٹ، پہلے سے سنی ہوئی کہانی، بیکن ہاؤس ملتان، ۲۰۰۳ء، ص ۴۳

۶۔ ایضاً، ص ۴۶

۷۔ انوار احمد، ڈاکٹر، پہلے سے سنی ہوئی کہانی، ص ۴۸

۸۔ انوار احمد، ڈاکٹر، قومی مفاد میں مرتب کی جانے والی ایک رپورٹ، پہلے سے سنی ہوئی کہانی، بیکن بکس ملتان
، ۲۰۰۳ء، ص ۷۸

۹۔ ایضاً، ص ۷۹

۱۰۔ انوار احمد، ڈاکٹر، جب راج کرے گی خلقِ خدا، آخری خط، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۰۳ء، ص ۱۱۲

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۱۵

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۱۸

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۱۳

۱۵۔ انوار احمد، ڈاکٹر، آسٹر وٹرف، آخری خط، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۱۹

۱۶۔ انوار احمد، ڈاکٹر، چند باتیں اپنوں سے، مجموعہ یاد گارِ زمانہ ہیں جو لوگ، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۱۰

۱۷۔ انوار احمد، ڈاکٹر، احمد خان درانی بابا، مجموعہ یاد گارِ زمانہ ہیں جو لوگ، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۱۳۲

۱۸۔ ایضاً، ۱۳۳

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۳۵

۲۰۔ انوار احمد، ڈاکٹر، پروفیسر خلیل صدیقی! میری محبوب شخصیت، مجموعہ یاد گارِ زمانہ ہیں جو لوگ، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۳۰

۲۱۔ ایضاً، ص ۳۱

۲۲۔ ایضاً، ص ۳۴

۲۳۔ انوار احمد، ڈاکٹر، بے نظیر بھٹو سے خلقِ خدا کا انمٹ لگاؤ، مجموعہ یاد گارِ زمانہ ہیں جو لوگ، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۲۲۲

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۲۳

۲۵۔ ایضاً، ص ۲۲۵

۲۶۔ ایضاً، ص ۲۳۰

۲۷۔ انوار احمد، ڈاکٹر، حمید اختر سپاہِ دانش کا بہادر سپاہی، مجموعہ یاد گارِ زمانہ ہیں جو لوگ، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۲۹۷

۲۸۔ انوار احمد، ڈاکٹر، میری زندگی میں آنے والے چند اور یاد گار لوگ، مجموعہ یاد گارِ زمانہ ہیں جو لوگ، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۳۰۸

۲۹۔ انوار احمد،ڈاکٹر، عرش صدیقی شعور وادراک کے پرچارک جذباتی انسان، مجموعہ یادگارِ زمانہ ہیں جو لوگ، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۳۸

۳۰۔ ایضاً، ص ۴۲

۳۱۔ انوار احمد،ڈاکٹر، حضرت جی بنام حسین بخش، مجموعہ یادگارِ زمانہ ہیں جو لوگ، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۲۰

باب سوم:

انوار احمد کی نثر میں منفی سیاسی عناصر کا مطالعہ

الف۔ انوار احمد کے افسانوں میں منفی سیاسی عناصر

انوار احمد کے افسانوں میں مثبت سیاسی عناصر کے ساتھ ساتھ منفی سیاسی عناصر بھی اہمیت کے حامل ہیں جن میں جبر و تشدد، بدعنوانی، ناانصافی، لاقانونیت اور آزادی اظہار کی پابندی وغیرہ شامل ہیں۔ اگر سیاسی جبر و تشدد کے حوالے سے دیکھا جائے تو انوار احمد کا افسانہ "شہر کا پہلا محب وطن بچہ "سیاسی جبر و تشدد کی بھرپور عکاسی کرتا ہے خصوصاً مارشل لاء دور کے ظلم و ستم اور جبر و استحصال کا عکاس ہے۔ اس افسانے میں ایک بڑے شہر کو کہانی کا حصہ بنایا گیا ہے۔ یہ شہر گنجان آباد ہے اور تمام معاملات میں خود کفیل تھا لیکن اچانک ایسا کچھ ہوا جس سے یہ محسوس ہونے لگا کہ ہر چیز میں سے اصل چیز غائب ہونے لگی ہے۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مارشل لاء سے پہلے عوام کو اپنی مرضی سے جینے کی آزادی تھی لیکن مارشل لاء کے بعد بات ان سے یہ حق چھین لیا گیا۔

’’شہر کا پہلا محب وطن بچہ‘‘ افسانے میں انوار احمد نے علامتی انداز میں سیاسی استحصال کی طرف اشارہ کیا ہے جب ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی اور مارشل لاء لگا دیا گیا پورا ملک مارشل لاء کی زد میں آ گیا تھا۔

’’چنانچہ اگلی صبح اس شہر کے لوگوں کے معاملات تو وہی رہے۔ مگر معنی اور مفہوم ان کی زندگی سے خارج ہو گئے۔ وہ ہنستے بھی تھے اور روتے بھی، مگر نہیں جانتے تھے کہ کیوں؟ وہ لکھتے اور پڑھتے تو تھے مگر پڑھنے کے لئے نہیں گھٹنے کی خاطر۔ وہ محبت بھی کرتے تھے اور نفرت بھی، مگر اس کے ہدف سے ناواقف تھے۔‘‘ (۱)

اس اقتباس میں بھٹو کی پھانسی اور ضیا مارشل لاء کے بعد ملک میں جو تبدیلی واقع ہوئی اس کو علامتی انداز میں بیان کیا گیا ہے کیونکہ بھٹو کی پھانسی کے بعد عسکری نظام حکومت کے آنے سے ملکی معاملات بدل گئے کچھ لوگوں کے مطابق اس مارشل لاء کا کوئی جواز نہ تھا۔ لوگ زندگیاں تو گزار رہے تھے لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کی زندگیوں کا کیا مقصد ہے۔ لکھنے پڑھنے کا سلسلہ بھی جاری تھا لیکن اس کو عوام تک پہنچانے یا ترقی کی غرض سے نہیں بلکہ گھٹنے کی خاطر پڑھا لکھا جا رہا تھا۔ ایسے حالات میں عوام یا تشدد زدہ لوگ جس طرف بھی قدم اٹھاتے تو انہیں اس بات کا اندازہ تھا کہ آگے اندھیرا ہے روشنی نہیں۔

’’وہ کچھ دیر اس منظر کو دیکھ کر اداس رہا اور پھر سوچنے لگا کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ اندھی رات چپکے سے اس کے شہر پر سے گزر جاتی۔ اسی لمحے اس پر گالیوں، مکوں اور لاتوں کی بارش ہونے لگی۔ اس نے بے ہوش ہونے سے پہلے چند کڑکتی آوازیں سنیں کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے اس حرام زادے کو سوچتے دیکھا ہے۔‘‘ (۲)

انوار احمد کا یہ افسانہ سیاسی، معاشی و معاشرتی اونچ نیچ اور مسائل کا بھرپور احاطہ کرتا ہے۔ افسانے کے اس حصے میں بھی افسانے کا کردار جب ملک میں جبر و تشدد کی صورتحال کو دیکھتا ہے تو پریشان ہوتا ہے اور سوچتا ہے کہ کیا ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ جبر و تشدد اور ظلم و ستم کی یہ رات خاموشی سے گزر جاتی۔ لیکن وہ ابھی یہ سوچ ہی رہا ہوتا ہے کہ اس پر گالیوں، لاتوں اور مکوں کی برسات ہونے لگتی ہے اس کو جبر و تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے کہنے کا

مطلب یہ ہے کہ سوچ پر بھی پابندی ہے ہم ظلم کرنے والوں کہ خلاف منہ سے بولنا تو دور کی بات ہے سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بظاہر مزاحمت اور احتجاج کرنا ایک الگ بات ہے لیکن کسی کی سوچ پر پابندی نہیں لگائی جاسکتی ہے مگر ملک کے اس بدترین سیاسی دور میں عوام اور ادیبوں کی سوچوں پر بھی پابندیاں لگادی گئی اگر وہ حکومتی اور سیاسی جبر و تشدد کے خلاف کچھ سوچتے بھی تو ان پر ظلم و ستم کیا جاتا تھا۔
سیاسی حالات کے پیش نظر مرد کی نفسیات پر جو اثرات مرتب ہوئے انہیں بھی انوار احمد نے افسانے کے موضوعات میں شامل کیا چونکہ انوار احمد روشن خیالی کے حامی نظر آتے ہیں اور وہ انسانی نفسیات کو سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ انوار احمد ایک ایسا دل رکھتے ہیں کہ وہ کسی بھی طرح سے ظلم و ستم اور جبر و استحصال کو برداشت نہیں کرتے۔ آپ مخلوق خدا پر ہوتے ہوئے ظلم و تشدد کو دیکھ کر تڑپ اٹھتے ہیں لیکن آپ کی تڑپ میں شور نہیں ہے بلکہ خاموشی ہے اور اس خاموشی کے ساتھ کرب کو اپنی کہانیوں میں بیان کرتے ہیں۔ ''شہر کا پہلا محب وطن بچہ '' اگرچہ ایک مختصر افسانہ ہے لیکن اپنے اندر بہت سے مسائل کو سموئے ہوئے ہے۔ افسانے کے درمیانے حصے میں ایک محفل کا اہتمام کیا گیا ہے جس میں صاحب کمال لوگ اپنی باری آنے پر ہر بار ایک ہی لطیفہ سنا کر داد وصول کرتا ہیں۔ لیکن اس محفل میں ایک ایسا شخص بھی ہے جو صاحب کمال لوگوں کو لطیفے سنانے پر داد دینے کی بجائے خاموش رہتا ہے اور وہ اس اندھیری رات کے متعلق سوچ رہا ہوتا ہے جس نے اس شہر کے حالات کو بدل کر رکھ دیا اس شخص پر صرف اس لیے تشدد کیا جاتا ہے کہ اس نے صاحب کمال لوگوں کے لطیفوں پر داد دینے کی بجائے خاموشی اختیار کی۔

''پھر گنجان آبادی کے اس شہر میں وہ اکیلا ہو گیا۔ جب ہر گھر کا دروازہ ایک ہی طرح سے اس پر بند ہوا۔۔۔ اور جب سبھی لوگ اس کے سائے سے بھاگنے لگے تو اسے دوست اور دشمن کی تفریح بھی مصنوعی سی لگی۔ ناچار درختوں اور پرندوں سے باتیں کرنے لگا۔۔۔ اب وہ اس

الجھن میں گرفتار تھا کہ نہ بولنے کا فیصلہ کریں تو سوچنے کا سزاوار ہو اور اگر بولے تو کس سے ؟ تنگ آکر اس نے خسرو کی ستار کے ٹوٹے ہوئے تار سے اپنی زبان کاٹ لی۔" (۳)

اس افسانے میں در حقیقت اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں مثبت سوچ رکھنے والے ،دانشوروں ،شاعروں ،ادیبوں ،فلسفیوں اور مظلوموں کی حمایت کرنے والے لوگوں سے حسد اور دشمنی کی جاتی ہے ایسے لوگوں پر جبر و تشدد کیا جاتا ہے تاکہ وہ مزاحمت سے کنارہ کشی اختیار کر لیں یا حق اور سچ بات کہنا چھوڑ دیں۔ جبکہ اس کے برعکس وہ لوگ جن کی سوچ منفی ہوتی ہے اور جن کے ضمیر سوچکے ہوتے ہیں اور ایسے لوگوں کو پروٹوکول مہیا کیا جاتا ہے۔اس افسانے میں کئی صدیوں پرانے گنجان آباد شہر کی بات ہو رہی ہے جس میں ایسی عوامی یا رعایا پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہوتی ہے جو سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہو اور جس کے بارے میں ذرا سا شخص بھی ہو تا کہ وہ سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو اسے غدار قرار دیا جاتا۔

"ننھے معصوم بچے اپنی توتلی زبانوں کے ساتھ جب سوال کرتے تو اس کی کوشش ہوتی کہ ان سوالوں کے ایسے جواب دیے جائیں کہ وہ اور سوال کریں تاکہ وہ خود یا ان کے بڑے سوچنے لگ جائیں کہ حاکم رعایا کی ذہانت سے کیوں ڈرتے ہیں ؟خود ساختہ امیر المؤمنین کیوں کہتے ہیں کہ محب وطن وہی ہے جو سوچتے بالکل نہ ہو۔ " (۴)

"اسی رات اس عورت نے شہر کے سرکاری زچہ خانے میں ایسا بچہ جنم دیا جو ازلی چیخ مارے بغیر ہی پیدا ہو گیا اور شفاخانے کے انچارج ڈاکٹر نے ایک پریس کانفرنس کے ذریعے اہل شہر کو خوشخبری سنائی کہ مسلسل چھ ہزار سال سے آباد ہمارے شہر میں بالآخر وہ بچہ پیدا ہو گیا ہے جو سوچنے کی فطری صلاحیت سے محروم ہے۔ " (۵)

افسانے کا ایک ایسا کردار ہے جو سکول استاد کے فرائض سر انجام دے رہا ہے اس سے جب معصوم بچے سوال کرتے تو اسے خوشی ہوتی اور وہ ان کے تمام سوالوں کے جواب دیتا تاکہ بچوں اور ان کے گھر والوں کے اندر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ افسانے کا اختتام اس وقت اور حالات کے مطابق کچھ ایسا ہی ان لوگوں کی

توقعات کے مطابق ہوتا ہے کہ ایک رات ایسا بچہ پیدا ہوتا ہے جو ازلی چیخ بھی نہیں مارتا اور پھر ایک پریس کانفرنس منعقد کی جاتی ہے اور جشن منایا جاتا ہے کہ چھ ہزار سال کے طویل عرصے کے بعد آخر وہ بچہ بھی پیدا ہو گیا ہے جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہے اس افسانے کے جبر و تشدد کا پہلو یہ ہے کہ غور کرنے والے اور سوچنے سمجھنے والے انسان ہی ختم کر دیئے جائیں تا کہ ان کے ساتھ جو تشدد ہو اس پر ردِ عمل ظاہر کرنے کے بجائے خاموش رہیں۔

انوار احمد معاشرے میں ہونے والی بد عنوانی اور ناانصافی کو افسانے کے موضوعات میں جگہ دیتے ہیں کیونکہ معاشرے میں ہونے والے ظلم و ستم اور بد عنوانی کے خلاف آواز بلند کرنا ہر کسی کے بس کا کام نہیں ہے۔ انوار احمد کا افسانہ ''شہید کا خواب '' ناانصافی اور ظلم کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ یہاں افسانے کا کردار ناانصافی اور تشدد کی کیفیت کو کچھ اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کبھی زندہ ہو رہا ہے اور کبھی مر رہا ہے اور ایسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ جیسے دوزخ میں ہے جہاں آگ ہی آگ ہے۔ فرشتوں اور ہیلی کوپٹروں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ، بدلتی ہوئی زندگی اور کمزور آرزوؤں کے آس پاس، ذلالت، ناانصافی اور جبر و تشدد د بدروحوں کی طرح اس کے ارد گرد منڈلا رہا ہے۔ حالات کے جبر کی لہریں کہانی کے کرداروں کے باطنی احساسات میں جاری و ساری رہتی ہیں اور کہانی کا کردار صرف یہ جانتا ہے کہ وہ ساری زندگی زیر تفتیش ہیں رہا مگر اس کو انصاف نہ ملا۔ حلف توڑنے والوں نے کہانی کے کردار کے ناخنوں کو گوشت سے جدا کر دیا بجلی سے اس کے نازک جسم کو جھٹکے دیئے گئے۔ یہ کردار ناانصافی، خوف، دہشت اور جبر کی زد میں ایسا محسوس کر رہا ہے جیسے کہ وہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہوا میں جھول رہا ہے۔

''پھر وہ شاید کئی مرتبہ مرا اور کئی مرتبہ زندہ ہوا، مگر ہر مرتبہ اسے احساس ہوا کہ وہ دوزخ میں ہے، کھڑ کھڑ کرتی ہوئی آگ، اس میں مسخ ہوتی ہوئی زندگی، فرشتوں اور ہیلی کاپٹروں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ اور انہیں اپنے وجود کے ملبے پر اترنے کی دعوت دینے کی دم بدم نحیف

ہوتی ہوئی آرزو جس کے آس پاس تفتیش، تذلیل اور تشدد بد روحوں کی طرح ناچ رہے تھے

۔" (۶)

"تمہارے ہاتھ میں تمہاری تقدیر کی سائیکلوسٹائلڈ کاپی تھمائی جاسکتی ہے، وطن دشمن، بے حیا، پیشہ ور جھوٹے!" یور آنر ایسے القابات دینے والوں کے بارے میں ناظم حکمت کہتا ہے۔۔۔"تمہیں مشکوک گواہ پیش کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی" یور آنر کیا مشکوک گواہ سے مراد ہر وہ شخص ہے جس کے بارے میں تفتیشی افسر کو شک ہے کہ وہ سچ بولے گا ؟ بد طنیت انسان، تمہیں پھانسی سے پہلے توہین عدالت کے جرم میں لٹکایا جا سکتا ہے، پھر ساری آوازوں پر شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ غالب آگئی، "یور آنر، یور آنر، شہد کی گستاخ مکھیوں نے توہین عدالت کا ارتکاب کر ڈالا ہے، ان لٹکایئے، یور آنر انہیں سزا دیجئے"۔(۷)

افسانے کا یہ اقتباس مارشل لاء دور میں جب عدالتوں پر فوجی قبضہ ہو گیا تو اس صورت حال کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے اگر کوئی شخص حق پر بھی ہوتا تو عدالت میں اس کے خلاف فیصلہ کیا جاتا ہے اس کو انصاف سے محروم رکھا جاتا اور اگر وہ اپنے حق کے لیے بولتا تو اس کو توہین عدالت کے الزام میں سزا دی جاتی اگرچہ وہ بے گناہ ہی کیوں نہ ہو۔ سچ اور حق کا ساتھ دینے والوں کو وطن دشمن کے لقب سے پکارا جاتا۔ یہاں تک کہ مجرم کو اپنی طرف سے گواہ پیش کرنے کی بھی اجازت نہیں دی جاتی کیونکہ ہر اس کو گواہ مشکوک قرار دیا جاتا جس کے بارے میں تفتیشی افسر کو شک ہوتا۔ مارشل لا کے بدترین دور میں انصاف اور حق کی بات کرنے والوں کو جسمانی اور ذہنی سطح پر کوڑے مار مار کر مفلوج کر دیا۔ انوار احمد کا یہ افسانہ بھی علامتی ہے کیونکہ ظاہری طور پر حکومت کے خلاف بولنے والوں پر تشدد کیا جاتا تھا اور ان کو جیلوں میں ڈال دیا جاتا چنانچہ اس تشدد اور ناانصافی کے دور میں انوار احمد نے اپنے ذہن کو اس عہد کے مطابق بخوبی استعمال کیا۔ اور سینے میں چھپے جذبات کو زبان عطا کرنے کی کوشش کی۔ کیونکہ ایسے دور میں گالی گلوچ اور ہذیان بکنے کے علاوہ جذبات کو ٹھنڈا کرنے کا کوئی اور راستہ نہ تھا۔

"جیل کا وہ سائرن، جس سے زیادہ گونجیلی اور نوکیلی آواز اس علاقے میں اور کوئی نہ تھی
،بچوں کے اس کھلونے جیسی آواز نکال رہا تھا جس کے سیل کمزور ہو جائیں، ہوا میں مٹی،
دھواں، کوڑے مارنے اور کوڑے کھانے والوں کی کھالیں جلنے کی بو اور بے سمت
چیخیں شامل ہو گئیں، پھر ایک اور دھماکہ ہوا اور یہ سب کچھ اس کے گوشت کے اندر گھس
گیا، بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے دہشت زدہ آنکھوں سے دیکھا کہ وہ کٹی ہوئی پتنگ
کی طرح ہوا میں جھول رہا ہے۔" (۸)

آمریت کے اس دور میں حکومت کے خلاف احتجاجی رویہ اختیار کرنے والوں کو جیل میں ڈالا گیا افسانے کے اس حصے میں دراصل انوار احمد مارشل لاء دور کی جیلوں کی صورتحال کو بیان کرتے ہیں کہ جیل کے سائرن سے اونچی آواز علاقے میں کسی اور کی نہ تھی اور جیل کا سائرن بج بج کر اس حد تک کمزور ہو گیا تھا جیسے بچوں کا کوئی کھلونا ہو جو بار بار بجانے کی وجہ سے کمزور ہو گیا ہو۔ ہر طرف مٹی اور دھواں تھا کوڑے کھانے والوں کی کھالوں کی جلنے کی بو ہر طرف پھیل چکی تھی اور چاروں طرف سے چیخیں ہی سنائی دیتی تھیں۔ افسانے کا یہ واحد غائب کردار ہے جو اپنی داستان سنا رہا ہے۔ یہ افسانہ ہندو مسلم دشمنی کی بھی نمائندگی کرتا ہے جس میں بھارتی باشندے پاکستانی ہونے کی بنا کہانی کے کردار کو آگ میں دھکیلتے دیتے ہیں۔ کہانی کا واحد غائب کردار جج کو اپنے عہدے پر فخر کرتے ہوئے دیکھتا ہے لیکن اس شخص اس بات کا یقین تھا کہ ایک دن انصاف ضرور ہو گا اور ایسا ہی ہوا پھر ایک دھماکہ ہوا اور چاروں طرف آگ پھیل گئی تمام مکر و فریب اور لالچ اس میں جل کر راکھ ہو گئے اور وہ شخص امید کی انگلی کو تھم کر دوزخ سے نکل گیا۔ یہاں بھی انوار احمد نے علامتی انداز ہی اپنایا ہے۔ کہانی کے کردار کو امید تھی کہ اگر دنیا میں مجھے انصاف نہیں ملا تو آخرت میں تو ضرور ہی مل جائے گا۔

"پھر ایک دھماکہ ہوا،" چاروں طرف آگ کا دریا ٹھاٹھیں مارنے لگا، سارے فرمان،
سارے وعظ، سارے لالچ اور مکر کے سارے لبادے اس میں جلنے لگے اس کے بعد وہ
زندگی کی آس کی انگلی تھام اس دوزخ سے نکل گیا۔۔۔ آخرکار اپنے شہر میں پہنچ گیا، وہاں

ایک بڑا جلسہ ہو رہا تھا، جس کی صدارت اس کی اپنی تصویر کر رہی تھی جس کے نیچے اس کے نام کے ساتھ ہی دیکھا تھا۔" (۹)

افسانے کے عنوان "شہید کا خواب" سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ افسانے کا کردار جب زندہ تک تو وہ ایک ہی خواب دیکھتا تھا کہ ایک دن انصاف ضرور ملے گا لیکن اس کی زندگی میں ایسا نہ ہو سکا۔ اس نے ساری زندگی صرف اس امید پر گزار دی کہ ہر طرف امن و انصاف اور حق سچ کا بول بالا ہو گا مگر ایسا نہ ہوا اس نے بہت سے تفتیشوں، مصیبتوں اور اذیتوں کا سامنا کیا بلکہ ان کا ڈٹ کر مقابلہ بھی کیا اور ایک خواب ایک امید لے کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ لیکن حقیقت میں اس کا یہ خواب اور خواہش پوری نہ ہو سکی۔ اس افسانے میں سیاسی قیدیوں پر تشدد کے مناظر کی نشاندہی کی گئی ہے۔ عدالتی کارروائیوں کا پول بھی کھولا گیا ہے، جسے چاہے وطن دشمن اور غدار ثابت کر دیں، جیسے چاہے خود ساختہ مقدمات میں پھانسی پر لٹکا دیں۔ اس کہانی میں ہماری جیلیں اور عدالتیں ابن الوقتی کا مظاہرہ کرتی ہیں اور ہر نئے حاکم کے تسلسل کو قائم رکھنے میں اپنا پورا زور لگا دیتی ہیں اور بے گناہوں اور مظلوموں کو انصاف نہیں ملتا۔ اس افسانے میں عدالت اور جیل کے مناظر دونوں ایک ساتھ چلتے ہیں جہاں قانون اور انسانیت کی دھجیاں اڑائی جا رہی ہیں۔

انوار احمد کا افسانہ ''بیج والا آدمی'' ۱۹۷۷ء کے مارشل لا کے بعد آزادی رائے پر لگائی جانے والی پابندی کا اظہار ہے۔ ایک آزاد ملک حاصل کرنے کے لیے پاکستانی عوام نے مل کر قربانیاں دیں ظلم و ستم اور جبر و تشدد کو برداشت کیا انگریزوں اور ہندوؤں کے ساتھ وطن کی خاطر جنگیں لڑیں لیکن آزادی کے بعد اپنے ہی ملک کی حکومتی پارٹیوں نے آپس کے اختلافات کی وجہ سے عوام کو بھی اذیت میں ڈال رکھا ہے۔ تمام سیاسی پارٹیاں حکومت میں آنے کے لئے پوری قوم کو مشکلات میں ڈال دیتی ہیں اور عوام سے ہمدردی کی امید رکھتی ہیں۔ ملک کے لیے ہمیشہ عوام نے ہی قربانیاں دی ہیں سیاست دان کسی بھی حادثے کے بعد میڈیا پر جا کر زخمیوں اور مرنے والوں کے لیے جو ہمدردی کے دو بول بول دیتے ہیں اور یہاں تک کہ عوام کی قربانیوں کو

دیکھنا بھی گہوارہ نہیں کرتے۔ ستر کی دہائی میں حکومت نے مذہب کی آڑ میں لوگوں کے جذبات سے کھیلا اور مذہب کے نام پر لوگوں سے قربانیاں مانگیں۔ لیکن ہمارے مذہب میں تو آزادی اظہار پر کوئی پابندی عائد نہیں ہے ملک کے تمام باشندوں کو حق اور سچ کا ساتھ دینے کے لئے آزادی ہے۔ عوام اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کر سکتے ہیں اس لیے ان پر کسی قسم کا جبر اور زبردستی نہیں ہے۔

”بیچ والا آدمی“ بھی ایک ایسا ہی افسانہ ہے جس میں آزادی اظہار پر پابندی کو علامتی انداز میں انوار احمد نے تحریر کیا ہے۔ کہانی کا کردار جس نے زندگی میں نشیب و فراز کا سامنا کیا لیکن اس کی آنکھیں خوابوں سے محروم ہو گئیں اور ایک ایسا وقت آیا جب تصورات، یادیں سب گڈ مڈ ہو گئے درد مندی، بیدردی، اپنائیت، بے تعلقی، مزاحمت اور صبر سب ریزہ ریزہ ہو گئے۔

”میں جب فاقے سے تھا تو کہتا تھا روٹی سب کچھ ہے، محبت میں تھا تو حسن کا ہر رنگ میرا آئیڈیل تھا، ہسپتال، قید خانہ، قبرستان، لائبریری، دوستوں کی محفل، گھنا جنگل ،اور آدمیوں سے پٹی سڑک، میں جہاں بھی گیا، زندگی کے کسی نہ کسی قائم مقام سے میرا تعارف ہوا اور ہر مرتبہ میں اس اذیت بھری مسرت سے دوچار ہوا جسے کتابوں میں بہت کچھ لکھتے ہیں اور پھر اعلان ہوا کہ پورے ملک میں سرد خانے کھول دیے گئے ہیں۔ جہاں ایک شخص اپنے حصے کا جغرافیہ، تاریخ، ادب و شعر اور آنکھیں جمع کرادے جس کے صلے میں ہر شخص کو ایک خوش نصیب بے تعلقی دی جائے گی۔“ (۱۰)

کہانی کے اس اقتباس میں انوار احمد نے آزادی اظہار پر پابندی کو واضح کیا ہے کہ ملک میں ایک ایسا وقت آیا کہ سیاسی حالات کے پیش نظر حکمرانوں نے سرد خانے کھولے اور ہر شخص سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے حصے کا ادب، تاریخ، جغرافیہ یہاں تک کہ اپنی آنکھیں بھی اس سرد خانے میں جمع کرادیں دراصل یہاں پر انوار احمد کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مارشل لا کے دوران ادیبوں پر حکومت کے خلاف لکھنے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی اور وہ اپنی رائے کا اظہار اپنی تحریروں میں بھی نہیں کر سکتے تھے اس لیے حکومت نے یہ اعلان کیا کہ اپنی

تحریروں کو سرد خانوں میں جمع کروادیں جس کے بدلے میں تمہیں اچھا صلہ دیا جائے گا۔ عوام اور ادیبوں کو ذہنی صلاحیتوں سے محروم کرنے کی کوشش کی یہاں تک کہ سوچنے اور سمجھنے پر بھی پابندی لگادی۔ کہانی کے اس کردار نے اپنا سب کچھ بھی اس سرد خانے میں جمع کرادیا تھا یا شاید اپنے لئے تھوڑی سی زمین اور تھوڑا سا آسمان رکھ لیا تھا۔ اس افسانے میں قیدیوں کے حوالے سے بات کی جارہی ہے کہ ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر جیل میں لایا جاتا تھا اور یہ وہ لوگ تھے جو اپنے حق کے لیے آواز بلند کرتے تھے۔

''درداں دی ماری دلڑی علیل اے'' بھی ایک ایسا افسانہ ہے جس میں گونگا ہونا حب الوطنی کی علامت ہے۔ حکومت کے خلاف لکھنا یا بولنا ریاست سے غداری قرار دیا گیا۔ بھٹو کی پھانسی کے بعد ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دوران کی گئی مذہبی اور سماجی اصطلاحات اور پس پردہ اصل حقیقت کی نشاندہی بھی اس افسانے میں کی گئی ہے۔

> ''اور پھر جو رات آئی، تو اس کی صبح نہ ہو سکی، آدھی رات کے اندھیرے میں ہی روشن آنکھوں والے کی لاش اس طرح رکھ دیں گی کہ ہم سب اس وہم میں مبتلا ہوتے کہ قاتل ہم ہی ہیں اور کبھی اس خوف میں گرفتار کہ مقتول بھی ہم ہی ہیں۔ ذرا دیر بعد میں جو ہوش میں آیا، وہ رونے لگا، فوراً اس پر ایک بازو جھپٹا۔۔۔۔ تب ان پر یہ کھلا کہ ہمیں گریہ کا حق بھی نہیں کہ ہم مبادا سکتے کی حالت سے باہر آجائیں۔'' (۱۱)

حکمران دراصل ایک ایسی عوام یا رعایا چاہتے ہیں جو اپنے حقوق کے لیے آواز بلند نہ کریں۔ عوام کو بھیڑیں بنا کر ادب اور صحافت میں پروپیگنڈہ بنا کر استعمال کیا جاتا ہے۔ اور ظلم و تشدد سے ان کے ذہنوں کو بگاڑ دیا جاتا ہے تاکہ وہ عقل و دانش سے محروم ہو جائیں۔

انوار احمد کے افسانوں میں کہیں کہیں ہمیں بدعنوانی، لڑائی جھگڑے اور رشوت خوری جیسے عناصر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بدعنوانی جمہوریت اور قانون کی حکمرانی کو کمزور کرتی ہے۔ زندگی کے معیار کو تباہ کرتی ہے اور انسانی

حقوق کی خلاف ورزی کرتی ہے۔ انتہا پسندی اور دہشت گردی کو بدعنوانی پروان چڑھاتی ہے بدعنوانی ملک کے تمام انتظامات کو تباہ و برباد کر دیتی ہے حکومت پر فرض ہے کہ وہ اپنے شہریوں کو بدعنوانی کی زیادتیوں سے محفوظ رکھے۔ بدعنوانی کی صورت میں پیدا ہونے والی حکومتی بداعتمادی کی فضا لوگوں کو دہشت گردی کی جانب راغب کرنے والے حالات پیدا کر دیتی ہے۔ انوار احمد کا افسانہ "دعا کی تلاش" دہشت گردی اور بدعنوانی کی عکاسی کرتا ہے۔ یہاں ایک عورت کی کہانی بیان کی گئی ہے جو اپنے دکھوں اور زخموں کی روداد سائیں کے پاس لے کر جاتی ہے۔ جس کے بیٹے کو کچھ لوگ پکڑ کر لے جاتے ہیں اور اس عورت کا جو بھی خدمت گزار بیٹا ہوتا ہے اس کو پکڑ لیا جاتا ہے اور اگر اس کی ماں یعنی وہ عورت منت زاری کرتی ہیں تو اس کے جواب میں کہہ دیتے ہیں کہ یہ تمہیں بیچنا چاہتا ہے۔

"میں کہتی ہوں کوئی ماں سے بھی تو پوچھے کہ کون اس کی عزت اور آبرو کا محافظ ہے اور کون لٹیرا۔ یہ کوئی نہیں سنتا، روتی اس لیے ہوں کہ جن کو وہ مجھ سے چھین لے جاتے ہیں میرا دل ان کے لیے ہی تڑپتا رہتا ہے۔ سائیں جی! اس سے پہلے کہ میرا یہ آدھا سر بھی ننگا ہو جائے، بستی کو برباد کر دے کہ ظلم کے برباد ہونے کا اور کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔" (۱۲)

انوار احمد کا یہ افسانہ معاشرے میں ہونے والی بدعنوانیوں اور ناانصافیوں کی منظر کشی کرتا ہے۔ کہانی کے کردار سائیں بابا سے ہر مظلوم دعا کی امید لے کر ان کے پاس جاتا ہے اور اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی داستان سناتا ہے اور اس کے جواب میں سائیں بابا کہتے ہیں کہ صبر کرو کیونکہ صبر سے زیادہ میٹھا پھل آج تک نازل نہیں ہوا پہلے ایک عورت اپنی مظلومیت کی داستان سناتی ہے کہ کس طرح کچھ لوگ اس کے بیٹے کو پکڑ کر لے گئے اور اس کے بعد ایک قیدی بوڑھا جس کے پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں زنجیر تھیں اور اس کی زبان کٹی ہوئی تھی۔

"اس کے پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں زنجیریں تھیں، اس نے بولنا چاہا تو لفظ کٹی ہوئی زبان کی طرف پھڑکنے لگے، سائیں جی نے کہا، "تمہاری بات ہم تک پہنچ گئی ہے جن کی قیدیوں کے پاس زبان نہ ہو وہ آنسوؤں سے کام لیں، ایک دن ان آنسوؤں کا زنگ، ان ہڈیوں اور زنجیروں کو کمزور کر دے گا، سائیں جی کی اس بات پر گویا ایک کہرام سا مچ گیا، بہت سارے دکھ، زخم اور آنسو ایک دوسرے کے گلے لگ کر رونے لگے اور کٹی آوازیں سائیں جی کے مقدس کانوں تک پہنچنے لگیں۔ سائیں جی، وہ میری کتاب چھین کر کہتے ہیں ہمارے منظور شدہ لفظوں میں بات کرو۔" (۱۳)

انوار احمد کا یہ افسانہ سیاسی، سماجی اور معاشی صورتحال کی نمائندگی کرتا ہے کے کس طرح حکومتی اراکین عوام کو اپنے اشاروں پر ناچنا چاہتے ہیں۔ عورت سے اس کا بیٹا چھین لیا جاتا ہے۔ بوڑھے کو قید کی مصیبتیں برداشت کرنی پڑی کچھ لوگوں کی جائیدادوں کو ہڑپ کر لیا گیا یہاں تک کہ لوگوں کی سوچ اور لفظوں کو بھی ان سے چھین لیا گیا اور ان کو حق سے محروم کر دیا۔ اس افسانے میں ظلم و ستم کے ساتھ اظہار رائے کے حوالے سے بھی انوار احمد نے بیان کیا ہے یہاں تک کہ اس کہانی میں امید کا عنصر بھی نمایاں ہے۔ جتنے بھی مظلوم لوگ سائیں جی کے پاس دعا کروانے آتے ہیں سائیں جی کہتے ہیں کہ تم سب میرے بچوں کی طرح ہو تم لوگوں کے دکھوں کی داستان سن کر میرا دل تڑپ اٹھتا ہے میں نے بھی یہ بستی علم اور ناانصافیوں کی بدولت چھوڑی ہے لیکن میں نے صبر کیا اور مظلوموں کا آخری آسرا صبر ہی ہوتا ہے۔

"سائیں جی! آپ ایک دفعہ تو آپ اپنے ٹیلے سے نظر نیچے ڈال کر دیکھیں کہ آپ کے بعد کون بستی کے مالک بن بیٹھے ہیں، وہ جوا کھیلتے ہیں، شراب پیتے ہیں، عزتوں سے کھیلتے ہیں پر ان کے لئے ہی رزق کی فروانی ہے۔ وہ لوٹ مار کرتے ہیں، حق چھنیتے ہیں، ظلم کرتے ہیں، پر تمام سرسبزی شادابی انہی کا مقدر رہے، سائیں جی ایک لفظ، بددعا کا ایک بول، پھر خواہ اس کے بعد ہم برباد ہی کیوں نہ ہو جائیں۔" (۱۴)

کہانی کے آخری حصے میں انوار احمد نے بھوک، افلاس کو بھی موضوع بنایا اور معاشرے میں ہونے والے معصوم اور ناحق لوگوں کو قتل کرنے کی مزاحمت بھی کی ہے۔ سائیں جی نے اپنے قافلے کے لوگوں کو ہمت اور حوصلہ دیا اور کہا کہ انسانی تخلیق کا عمل جاری ہے اس لیے امید کی کرن ابھی باقی ہے اور کوئی نہ کوئی ایسا بھی بستی میں پیدا ہو گا جو سب کے دکھوں کا مداوا کرے گا۔ مطلب ایک ایسی حکومت بھی قائم ہو گی جو حق کا ساتھ دے گی۔ سائیں جی کی اس بات پر قافلے کے ایک آدمی نے اپنا غم سنایا۔

> ”اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی اس نے اسے کھولا تو اس میں ایک دن کے بچے کی لاش نکلی، اس نے کہا" سائیں جی! میں روٹی کی تلاش میں دور نکلا تو پیچھے داناؤں نے میرے اس بچے کو گناہ کی نشانی قرار دیا، انہوں نے اس کی ماں کو تو گناہوں سے پاک کرنے کے لیے اپنے گھر میں رکھ لیا، پر اس معصوم کو پتھر مار کر ختم کر دیا۔“ (۱۵)

انوار احمد کا افسانہ ”بچھوؤں کے ساتھ رات“ مارشل لاء کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ یہ علامتی اسلوب میں لکھی گئی ایک کہانی ہے اور اس میں لاقانونیت اور عوام پر ہونے والے مظالم کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کہانی میں بچھو غیر ملکی اور اگر واضح الفاظ میں کہا جائے تو امریکی استعمار کی علامت ہے جو ملک میں مارشل لاء لیڈروں کے ان داتا ہیں۔ یہ بچھو ملک کے عوام کا بدن کاٹ کاٹ کر نیلا کر رہے ہیں۔ بچھوؤں کا نگہبان اندھیرا، اس ملک کے ناعاقبت اندیش حکمران اور دانشور ہیں۔ ان حکمرانوں کی ظلم و زیادتی پورے ملک کو متاثر کر رہی ہے۔ کہانی میں باپ وہ طاقت ہے جو بچوں کو حوصلہ دینے کے بجائے کم حوصلگی کی طرف مائل کرتا ہے اور وطن کی دھرتی یعنی زمین کے لئے گونگی ماں کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے ”دکھیاری ماں“ بھی علامتی کردار ہے جس کا آدھا سر ننگا، آدھے پاکستان کی علامت ہے اور یہ دکھیاری ماں اپنے وفادار بیٹوں کے ساتھ کیسے کہ ظلم و ستم کی کہانی سناتی ہے۔

> ”کمرے میں داخل ہو کر میں نے دیا جلایا تو ایک لمحے کو میں خوف سے لرز گیا۔ کمرہ بچھوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ بچھو زمین پر تھے۔ دیواروں پر تھے چارپائیوں کے نیچے تھے اور ان کے اوپر چڑھ

رہے تھے ایک بچھو میرے دائیں پاؤں کے قریب تھا اور دو بائیں طرف، اور میں نے دیکھا
ایک بچھو دیئے میں پڑا تھا روشنی نے ان ندھوں کو بوکھلا سا دیا تھا۔ جس سے حوصلہ پا کر میں نے
ایک دیمک زدہ لکڑی سے انہیں مارنا شروع کیا، مگر میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کس
کو ماروں، لکڑی ٹوٹی اور پھر میرا حوصلہ۔" (۱۶)

"بچھوؤں کے ساتھ رات" لا قانونیت، جبر و استحصال کا ایک استعاراتی بیان ہے جب ملک میں سیاسی حالات کے پیش نظر لا قانونیت، جبر و تشدد جیسے عناصر ظاہر ہونے لگتے ہیں تب پیغمبرانہ دلیلیں بھی اپنا اعتبار کھوٹا کرنے لگتی ہیں تو پھر رات کا شر غالب آجاتا ہے انوار احمد کہتے ہیں کہ معاشرہ بچھوؤں سے بھر چکا ہے۔

"اتنے عذابوں کا ثمر یہ ہے کہ اب بچھو اندھیرے میں میرے لیے راستہ چھوڑ دیتے ہیں
مگر اندھیرے کا اسرار اور بچھوؤں کا میرے لیے راستہ چھوڑنا وسوسہ پیدا کرتا ہے۔ یہی وسوسہ
رات کا شر ہے اور میں ڈرتا ہوں رات کے شر سے۔" (۱۷)

انوار احمد کا یہ افسانہ "بچھوؤں کے ساتھ رات" جبر واستحصال کے ساتھ ساتھ غربت، بھوک وافلاس اور بے روزگاری کو بھی ظاہر کرتا ہے انوار احمد کا یہ افسانہ استعاراتی افسانہ ہے اس افسانے میں سیاسی وسماجی مسائل بیان کیے گئے ہیں افسانے کا کردار اس حد تک غربت کا شکار ہے کہ اس کی پیدائش کے موقع پر اس کے باپ کو چراغ بھی ادھار لینا پڑا ملک کے خزانے پر امیر لوگ قابض ہو کر بیٹھے ہیں غریبوں کے لیے اندھیرے کے سوا کچھ نہیں ہے اور افسانے میں بچھو کا استعارہ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ کچھ لوگوں کی فطرت بچھو کی طرح ڈنگ مارنا ہوتا ہے۔ کیونکہ بچھو اندھا ہوتا ہے اور اندھا زیادہ خطرناک ہوتا ہے وہ کسی پر اعتماد نہیں کرتا ہے۔

(ب) انوار احمد کے خاکوں میں منفی سیاسی عناصر

جس طرح انوار احمد کے افسانوں میں منفی سیاسی عناصر کو اہمیت حاصل ہے بالکل اسی طرح ان کے خاکوں میں منفی سیاسی عناصر نمایاں نظر آتے ہیں اور ان کے خاکوں میں سیاست کا تذکرہ افسانوں کی نسبت

زیادہ ہے۔ انوار احمد نے ملک کے سیاسی حالات کے پیش نظر نہ صرف مثبت عناصر کی وضاحت کی بلکہ انہوں نے منفی عناصر کو بھی اپنی تحریروں میں شامل کیا اور ہمیشہ غیر جانبدار ہو کر کسی ایک پارٹی کی حمایت کیے بنا سیاسی نظام کے مسائل کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا۔ جس طرح انوار احمد کے خاکوں میں منفی سیاسی عناصر میں لا قانونیت، جبر و تشدد اور ناانصافی جیسے عناصر کو اہمیت حاصل ہے بالکل اسی طرح بدعنوانی بھی ایک منفی سیاسی عنصر ہے بد عنوانی، بد امنی اور انتشار کے حوالے سے دیکھا جائے تو انوار احمد نے "کریم ملک ۔۔۔مستاجری پر دیا ہوا ایک کھیت" کا جو خاکہ لکھا اس میں یہ عنصر نمایاں ہے۔

کریم ملک انوار احمد کے قریبی ساتھیوں میں سے ایک ہے اور وہ کالج میں انوار احمد سے تین کلاسز جونیئر تھا لکھنے لکھانے کا اس کو کافی حد تک شوق تھا یہ اس وقت کی بات ہے جب "امروز" اخبار کے مدیر مسعود اشعر تھے انوار احمد ہر ہفتے ایک کالم لکھا کرتے تھے جو امروز میں چھپتا تھا اور ایک ہفتے تک انوار احمد نے کالم نہ لکھا جس پر کریم ملک ان کو کہتے ہیں کہ مسعود صاحب کا کہنا ہے کہ کالم نہ لکھ آپ ہم سے اور قوم سے زیادتی کر رہے ہیں۔" کریم ملک۔۔۔مستاجری پر دیا ہوا ایک کھیت" خاکہ بدعنوانی اور بدامنی کی عکاسی کرتا ہے۔

"کچھ عرصے بعد بعض اساتذہ اور پرنسپل سے بدتمیزی کرنے پر اس پوری یونین کے عہدے داروں کو ہی کالج سے نکال دیا گیا اور نئی یونین کو نامزد کر دیا گیا، شاہد زبیر شاہد زبیر کو نیا سیکرٹری بنا کر ہنگامہ خیز تقریبات کی گئیں، مگر کچھ عرصے کے بعد نکالے گئے رہنماؤں میں سے کچھ واپس آ گئے، جس میں اسد اللہ شیخ مرحوم بھی شامل تھے۔" (۱۸)

کریم ملک کے پاس ان گنت تجربات اور مشاہدات تھے مگر اس نے دنیاوی عقل رکھنے والوں کا راستہ اختیار کیا۔ کبھی اقتدار پر فائز شخص سے ٹکراتا یا اختلاف کرتا۔ بچپن کی محرومیوں اور اوسط درجے کی تعلیمی کارکردگی نے اسے طاقتوروں کی لاٹھی بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ انوار احمد اور کریم ملک سیاسی مزاج اور ہم نشینوں کے اعتبار

سے مختلف تھے۔ تمام تکلیفوں، تذلیلوں اور محرومیوں کے باوجود کریم ملک کی حسِ مزاح زبردست تھی۔ اسی طرح انوار احمد کے خاکے ''فخر بلوچ عباس۔۔۔نہ نغمہ باقی نہ شادیانے'' میں کرپشن، دھاندلی اور بدعنوانی دیکھنے کو ملتی ہے۔ فخر بلوچ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۶۹ء تک گورنمنٹ کالج ملتان میں ایم اردو کی کلاس میں انوار احمد کے ہم درس تھے۔ انوار احمد کے ہم درس صلاح الدین حیدر کو ضیاء الحق کے زمانے میں شاہی قلعے کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں اور سیاسی و سماجی انقلاب کو روکنا اس وقت مشکل تھا۔ فخر بلوچ جب سٹوڈنٹس یونین کے صدر منتخب ہوئے تو یہاں سے ان کی ناکام سیاسی زندگی کا آغاز ہو گیا۔ ایوب خان کے خلاف تحریک میں طالب علم صفحے اول میں تھے۔

> ''ایوب خان کے خلاف تحریک میں طالب علم ہراول دستہ ثابت ہوئے۔ کالج بند کر دیئے گئے مگر کالج میں طالب علم روزانہ جمع ہو کر سڑکوں پر مارچ کرتے تھے، ہمارا جلوس جب یونین روڈ سے چوک کچہری تک پہنچتا تو ایک طرف وکلاء طالب علموں کی پذیرائی کرتے اور دوسری طرف گرلز کالج کی دیواروں کے پیچھے سے نقرئی تالیاں بہت سے نوجوان کے دلوں میں گونجتی تھیں۔'' (۱۹)

ایوب خان کے خلاف تحریک کے جلوس کی قیادت فخر بلوچ کر رہا تھا سیاسی مزاج کی بنا پر تحریک میں شامل ہونے کی وجہ سے فخر بلوچ کو کہیں بار جیل میں بھی ڈالا گیا۔ یہ ۱۹۵۸ء کے دور کی بات ہے اور ۱۹۵۶ء میں پاکستان کا پہلا آئین بنایا گیا، سکندر مرزا گورنر جنرل کی بجائے پاکستان کے صدر بن گئے بیوروکریسی اور فوج کی مکمل حمایت سکندر مرزا کو حاصل تھی ایوب خان اس وقت فوج کی کمان کر رہے تھے۔ ایوب خان کا ملازمت کی مدت پوری کرنے کے باوجود بار بار توسیع ملازمت کا بندوبست کر لینا بھی عوام کی نظروں کو کھٹکتا تھا۔ ایوب خان کے برسر اقتدار آتے ہی امریکہ نواز پالیسوں کا آغاز ہو گیا۔ ۱۹۷۷ء کے جن انتخابات کو دھاندلی والا انتخاب کہا جاتا تھا انوار احمد کہتے ہیں کہ اسی دوران قومی اتحاد کے ٹکٹ پر شیخ خضر حیات ملتان سے منتخب ہوئے تھے اور ضیا

ء الحق نے انہیں ہائی کورٹ کا جج بنا دیا انوار احمد اس طرح طالب علموں کے لیے لکھتے تھے اور آپ نے فخر بلوچ کے نظر بندی کے ایام اور سیاسی صعوبتوں پر بھی ایک جذباتی کالم لکھا۔

انوار احمد نے اپنے خاکوں میں ناانصافی جیسے مسائل کو جگہ دی ہے اس حوالے سے انہوں نے ''ملتان شہر یست در نواحِ ارشد ملتانی'' کا جو خاکہ تحریر کیا اس میں یہ عنصر نمایاں ہے۔ ارشد ملتانی مٹھاس اور احساس عزت نفس جیسے اوصاف کے مالک تھے۔ انوار احمد کا ارشد ملتانی کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ ایک شخص ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب کا نام ہے۔

''وہ ایک جواں ہمت اور باشعور شاعر ہے جو آشوبِ ذات کو آشوب زیست سے الگ تھلگ نہیں جانتا، حُسن وصداقت اور عدل واجتماعی کے رنگ ونور سے زندگی کی تخلیق نو کرتا ہے اور تیسری دنیا کے ان عظیم شاعروں اور ادیبوں کی صنف میں شامل ہو جاتا ہے جو بدصورتی کذب وریا اور ناانصافی کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں۔'' (۲۰)

ارشد ملتانی انوار احمد کے ایک سچے اور مخلص دوست تھے اور وہ ناانصافی سے انتہائی نفرت کرتے تھے وہ ایک معصوم اور کھرے انسان تھے ان کے پاس چھپانے کو کچھ بھی نہیں تھا سوائے اپنے اصل نام کے۔ انوار احمد ایک دفعہ ڈاکٹر وحید قریشی کی بورڈ آف اسٹڈیز کی میٹنگ میں آ رہے تھے کہ موٹر سائیکل سے گر کر زخمی ہو گئے کچھ دن ڈاکٹروں کے پاس بھی جاتے رہے مگر زخم میں پیپ پڑ گئی اور ڈاکٹر ان سے طنزً سوال کرتے کہ آپ پڑھے لکھے بھی ہیں؟ چنانچہ انہوں نے ڈاکٹروں کے پاس جانا چھوڑ دیا اور وہ ارشد ملتانی کے پاس جاتے وہ ہی ان کی مرہم پٹی کرتے تھے۔

''سیاسی اور سماجی موضوعات پر وہ بہت واضح نقطہ نظر رکھتے تھے اور اس کا بڑی جرات کے ساتھ اظہار کرتے تھے مگر حیران کن بات یہ ہے کہ ان کے مخالفین بھی ان کی دیانتِ فکر کا احترام کرتے تھے۔'' (۲۱)

ناانصافی اور بد عنوانی کو اگر مد نظر رکھا جائے تو انوار احمد نے "ڈاکٹر احمد بختیار اشرف ۔۔ایک خوش لباس اور خوش خیال ترک "کا جو خاکہ تحریر کیا اس میں نمایاں ہے ۔ اے بی اشرف ملتان میں ۱۹۳۵ء کو پیدا ہوئے وہ ایک خوش رُو، آزاد اور روشن خیال انسان تھے ۔اے بی اشرف پر جوش ترقی پسند افکار کی وجہ سے اپنے دوستوں اور شاگردوں میں بہت مقبول تھے ۔ انقرہ یونیورسٹی میں وہ پروفیسر کے عہدے پر مامور رہے ۔ اس کے بعد ایمبیسی سکول اور کالج کے پرنسپل بھی رہے جہاں ان کے ساتھ ناانصافی کا ایک واقع پیش آیا ایک ریٹائرڈ جرنیل سفیر نے انہیں عہدے سے سبکدوش کر دیا کہ آخر اردو کا پروفیسر کس طرح ادارے کا سربراہ ہو سکتا ہے ۔ وہ آخری عمر تک ترکی میں ہی مقیم رہے کیونکہ وہ پاکستان کے سیاسی نظام سے مطمئن نہیں تھے ۔

"انقرہ یونیورسٹی میں بھی انہوں نے اسی طرح کی تحقیق میں رہبری کی، جب کبھی پاکستان آتے ہیں، بد قسمتی سے لوڈشیڈنگ، ڈاکہ زنی اور ایک نامقبول حکومت کے خلاف ایک رائیگاں قسم کا واویلا ہوتا ہے، جس سے افسردہ ہو کر وہ اعلان کرتے ہیں، میں اس وقت تک ترکی سے نہیں نکلوں گا جب تک وہ میرا کھٹڑا، یا چارپائی اپنی سرحد سے باہر نہیں رکھ دیتے۔" (۲۲)

انوار احمد نے "ہمارا پپو اصغر ندیم سید ۔۔ ایک شاعر کی واپسی" خاکے میں جا بجا سیاسی جبر و تشدد کا ذکر کیا ہے ۔ کسی بھی معاشرے میں سیاسی رویے اور رجحانات مرکزی حیثیت رکھتے ہیں چنانچہ انوار احمد معاشی و سماجی مسائل کی ہی نہیں بلکہ سیاسی مسائل کی نشان دہی بھی اپنے خاکوں میں کرتے ہیں ۔ ظلم و بربریت، تشدد، دہشت گردی یہ سب حکمرانوں کے زیر اثر پروان چڑھنے والے رویے ہیں چنانچہ سیاست زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز ہوتی ہے ۔ دولت، شہرت اور عورت کے حوالے سے کامیابیوں کا سفر طے کرنے والا عموماً تنہا ہو جاتا ہے ۔ لیکن اصغر ندیم اپنے دوستوں، طالب علموں اور ادیبوں وغیرہ میں بہت مقبول ہے چونکہ ان کا تعلق ملتان سے ہے اس لیے انہوں نے ملتانیوں کے برعکس صبر و رضا اور توکل سے کام لینے کی بجائے ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش جاری

رکھی۔ انہوں نے زندگی کے تمام پہلوؤں کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا اس لیے وہ ملک کے سیاسی حالات اور جبر و تشدد کے متعلق کہتے ہیں۔

"یہاں اس کی کلکاری، للکار میں تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ ہر غاصب کو اس متروک

سمجھے جانے والے زمیں زاد کی طرح للکارتا ہے جس کے زخموں پر وطن کا نقشہ

بندھا ہوا ہے، اور زخموں پر وطن کا یہ نقشہ نمک پاشی کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے، مگر

یہ وعدے یا کومٹ منٹ کا وہ علم ہے جسے ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد

بھی پاکستانی تخلیقی ضمیر نے ریاکار تشدد کی جانب سے مسلط کردہ رات میں بھی تھامے

رکھا۔ چنانچہ وہ اس سیاہ رات میں یہ سوال کرتا ہے جو اس طرح سے سوچنے والوں کی

راہ میں روشنی بن جاتا ہے۔" (۲۳)

یہاں انوار احمد نے ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء پاکستان کی تاریخ کے سیاہ دن کی طرح اشارہ کیا ہے۔ پاکستان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو معروض وجود میں آیا تھا اس کے قیام کے بعد ابھی ۲۴ سال ہی گزرے تھے کہ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان دولخت ہو گیا۔ اس کے پسِ پشت جو بھی عوامل ہیں لیکن نئی نسل اس واقعے کی ذمہ داری اپنوں کی عاقبت نااندیشی کو قرار دیتی ہے۔ حکومتِ پاکستان کے اقدامات کے باوجود بنگال والوں نے علحیدگی کی تحریک شروع کردی مشرقی پاکستان کی افواج بھارت کے ساتھ اتحاد کرنا چاہ رہی تھیں اس لیے ان کے ہتھیار ڈال دینے کی وجہ سے بھارت نے ۹۰ ہزار پاکستانی فوجیوں کو قیدی بنالیا۔

"تم کہتے ہو، ہاتھ تمہارے لمبے ہیں، کتنے لمبے؟

کیا بارش کی دھاروں سے بھی زیادہ لمبے ہیں؟

کیا سورج کی کرنوں سے بھی زیادہ لمبے ہیں؟

کیا میرے وطن کے نقشے سے بھی زیادہ لمبے ہیں؟ (سیاہ

رات میں روشن سوال)" (۲۴)

"ایسے میں جب وہ کسی غاصب کو اُجلی وردی پہن کے ایسا پودا لگاتے دیکھتا ہے
جس کی لکڑی سولی کے کام آتی ہے تو وہ بچے کو خواب میں ڈرتے، لفظوں پر پٹی
بندھتے زخمی شہزادے کو آخری خطبہ دیتے اور زمین کو بین کرتے دیکھتا اور سنتا ہے، وہ
عاشق کے کاسٹیوم میں یہ منظر دیکھ کر لیتا ہے مگر اُسے اپنی چھٹی کا دن بھی عزیز
ہے، دودھ، شہد اور سیب کا ناشتہ اُسے صبح کے فریب میں مبتلا کرتا ہے چنانچہ وہ رات
کٹنے سے پہلے لوٹ جاتا ہے۔" (۲۵)

انوار احمد اصغر ندیم کے خاکے میں سیاسی صورت حال کو بیان کرتے ہیں کہ کس طرح لوگوں پر بغیر کسی تحقیق کے جبر و تشدد کیا۔ مارچ ۱۹۸۱ء میں جب پی آئی اے کا طیارہ اغواہ ہوا تو ملتان سے انوار احمد اور ان کے ساتھ کچھ اور پروفیسروں کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے اور ظلم کی تو بات یہ ہے کہ جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا تھا ان لوگوں نے ہوائی اڈے کو ابھی تک اندر سے دیکھا تک نہیں تھا۔ یہاں دراصل انوار احمد کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کس طرح بغیر تفتیش کے اتنے لوگوں پر جہاز کے اغوا ہونے کا الزام لگا جا سکتا ہے۔

"مارچ ۱۹۸۱ء میں جب پی آئی اے کا طیارہ اغوا ہوا تو ملتان سے مجھ سمیت ایسے
پروفیسروں کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے، جنہوں نے اس وقت ہوائی اڈہ بھی اندر
سے دیکھا ہوا نہیں تھا۔ ایک ایسا دوست فیض عابد عمیق اپنی عمر کے کچھ چھ مہینے کال
کوٹھڑیوں، ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی تذلیل کے حوالے کر کے نکلا تو باقی قبیلے والوں کا حال
معلوم کرنے ایک رات لاہور میں رک گیا۔" (۲۶)

اس دوران پاکستان میں شخصی حکومتوں کی وجہ ہر قسم کے حرص و ہوس کو آئینی تحفظ حاصل تھا۔"فرمان فتح پوری۔۔اردو علم وادب کا ایک رومانوی کردار" کا انوار احمد نے جو خاکہ تحریر کیا اس میں بھی سیاسی جبر و تشدد کی عکاسی ہوتی ہے۔ فرمان فتح پوری کو سینیٹ کی ایک نشت کے لیے ٹکٹ کی آفر کی گئی کہ آپ کو مرکزی تعلیم بنایا جائے گا کیونکہ وہ رضاکار ریٹائرڈ جرنیل وزیر تعلیم سے بہت تنگ تھے مگر فرمان فتح پوری نے یہ پیش کش ٹھکرا

دی اور معذرت کر لی۔ یہاں ضیاء الحق کے دورِ حکومت یعنی مارشل لاء دور کی طرف اشارہ ہے جب ہر شعبے میں فوجی حکومت تھی یہاں تک کے تعلیم کا انتظام وانصرام بھی فوجی جرنیلوں کے پاس تھا جس سے کچھ لوگ بہت تنگ تھے۔ فرمان فتح پوری نے جمیل الدین عالی کی عبرت ناک مثال کو سامنے رکھا کہ دنیا طلبی میں آپ اپنی عاقبت ہی نہیں، دنیا بھی خراب کر بیٹھتے ہیں لیکن کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ ضیاء الحق کی جانب سے وزارت کی ایسی دعوت کو وہ قدرت اللہ شہاب کے مشورے پر رد کر چکے تھے۔

"پاکستان کی اعلیٰ درسگاہوں اور علمی مراکز کو شخصی حکومتوں اور بالخصوص ضیاء الحق کے مارشل لاء نے بے حد نقصان پہنچایا، بہروپ کو فروغ ملا، فکری بددیانتی نے منفعت ، جاہ اور قربِ شاہ کے ایسے پلازے بلکہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کھڑے کر دیئے۔۔۔ علم وفضل کے سپرد صرف ایک فریضہ ہوا کہ احساس جرم میں مبتلا حکمران کو یقین دلایا جائے کہ وہ پاکستان کے آئین، اخلاق، ثقافت اور اجتماعی احساس کو مسمار اور مسموم کرنے کے لیے جو بھی اقدام کرتے ہیں وہ منشائے ربانی کے عین مطابق اور نظریہ پاکستان کے حقیقی تقاضوں سے عہدہ بر آہ ہونے کے لیے کرتے ہیں۔ اس عالم میں ملتان کے روشن خیال اور پیش قدم اساتذہ کو جس طرح شاہی قلعے کی سیر کرائی گئی، نظر بند کیا گیا، دور داز علاقوں میں ٹرانسفر کیا گیا۔" (۲۷)

ضیاء الحق کے مارشل لاء نے ملک کو بے حد نقصان پہنچایا بہروپ اور فکر کی بددیانتی کو فروغ ملا تعلیمی اداروں پر فوج کی حکمرانی ہو گی اساتذہ کو نظر بند کیا گیا اور یہاں تک کہ ان کے ٹرانسفر بھی دور شہروں میں کر دیے گئے۔ اس دور میں ادیبوں نے بھی استعاراتی اور علامتی انداز میں خوب مارشل لاء کے خلاف لکھا اصغر ندیم سید کی شاعری اور ڈراموں میں جلاوطن ایک بلیغ استعارہ بن گیا مگر کچھ ادیبوں کو تو مخصوص الفاظ دیے گئے کہ وہ اپنی تحریروں میں انہی الفاظ کا استعمال کریں۔ انوار احمد کا یہ خا کہ اظہار رائے کی پابندی کی نمائندگی بھی کرتا ہے

کہ عافیت پسند دانشوروں کو مخصوص الفاظ استعمال کرنے تک محدود کر دیا گیا۔ اس خاکے میں آزادی اظہار کے علاوہ جبر وتشدد بھی نمایاں ہے۔

"عافیت پسند، دانشوروں کو مخصوص الفاظ کا کوٹہ دیا گیا کہ وہ بیٹھے بس ان کی جگالی کرتے رہیں۔ آزادی کے اظہار کی امنگ ان کے لئے سرعام کوڑوں کی دعوت اور تحریک بن گئی، جن کے نتیجے میں جنم لینے والی چیخوں اور سسکیوں کو ہر آنگن میں نشر کرنے کا انتظام بخوبی کیا گیا تھا"۔ (۲۸)

ضیاء الحق کے آخری دور میں خوش خیالی تو خیر معدوم ہوئی ہی یہاں تک کہ لوگ خوش مقالی کو بھی ترس گئے کیونکہ خوف اور خوشامد نے لفظ اور لہجے مسخ کر دیئے تھے۔ ادیب بھی ظلم کے مارے اور ستائے ہوئے تھے ڈاکٹر وحید قریشی ایسے گھاگ علماء کی ملتانیوں سے خراج طلبی کے ستائے ہوئے بھی تھے۔ اس لئے لڑکھڑاتی زبان اور لرزتی جیب کے ساتھ کو فرمان فتح پوری کے پاس پہنچے۔ کراچی میں ایک تقریب کے درمیان تمام شعراء اور ادیب جمع تھے اور ضیاء الحق مارشل لاء اور جماعت اسلامی کے خلاف مجلس تبرا برپا کرتے اور جو مہمان تقریب میں روشن خیال ہوتا اس کی سب سے زیادہ خاطر تواضع ہوتی۔ اور اس تقریب میں ان افسروں کو بلایا جاتا جو مستقبل میں مارشل لاء یا ضیاء الحق کے خلاف بولے گئے اور سنائی دیں گئے۔

"فرمان صاحب کو دیکھا تو انہوں نے سردیوں میں ٹھنڈے پانی کا ایک پورا جگ ہم سب پر اور ہمارے عمل پر انڈیل دیا" آپ لوگ وقت ضائع کرتے ہیں ارے کبھی مارشل لاء طعنوں اور کوسنوں سے کسی ملک سے جاتا ہے؟ ٹینکوں، توپوں اور میزائلوں کا تم لوگوں کے لطیفے اور جگتیں کیا بگاڑ سکتی ہیں؟ اور تم جماعت اسلامی سے وابستہ، اساتذہ کو برا بھلا کہتے ہو، ارے وہ لکھتے ہیں، چھپتے ہیں، اپنی اہلیت اور لیاقت بڑھا کر عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔" (۲۹)

فرمان فتح پوری نے محفل میں موجود شرکاءسے کہا کہ آپ لوگ بے کار کا وقت برباد کر رہے ہیں مارشل لا کو طعنے اور کوسنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور نہ یہ ہماری مرضی سے ملک سے جائے گا اور تم لوگوں کے لطیفے اور جگتیں فوجی حکومت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ہیں۔ اور اور اگر تم لوگ جماعت اسلامی کے خلاف ہو یا ان کو برا بھلا کہتے ہو تو اس سے ان کو کوئی فرق نہیں پڑتا وہ عسکری حکومت کی خوشامد کے لیے لکھتے ہیں اور اپنی شان بڑھا کر اونچے عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں۔

غلامی کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو انوار احمد نے "شائستہ جمال!' اگلے جنم "موہے بِٹیا ہی کیجیو "کا جو خاکہ تحریر کیا اس میں لڑکیوں کی غلامی اور آزادی کے متعلق بحث ہے۔ انوار احمد کہتے ہیں کہ ہمارے شعبے میں لڑکیوں کے حق کا پلڑا ہمیشہ بھاری رہا۔ ہمارے شعبے میں لڑکیوں کی تکریم کے حوالے سے روشن خیالی اور رواداری پیدا ہوئی۔

"بے شک پنجاب یونیورسٹی اور تختِ لاہور کے دامن میں بہت کچھ ہے مگر ہمیں بھی یہ فخر کرنے دیجئے کہ ہم وہاں پر قابض زعمِ پارسائی کے دل میں کھٹکتے رہے ہیں آج شاید اس بات کو سمجھنا آسان نہ ہو کہ ہم نے ضیاء الحق کے دور میں منٹو، فیض، بیدی اور مبارک علی وغیرہ کے ساتھ پاکستانی زبانوں کے نمائندہ تخلیق کار کس جتن سے نصاب میں شامل کیے اور اس کے عوض کیسے فتوے اور کیسے وارنٹ ہمارے تعاقب میں رہے۔"
(۳۰)

ضیاء الحق کے دور میں اردو ادب میں روشن خیالی کی روایت اور افسانوں میں جلاوطنی کے اظہار کے حوالے سے کتابیں شائع ہوئیں اس کے بعد اساتذہ نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالات کو اپنے وسائل سے شائع کرنا شروع کیا اور اس کے لئے انہیں اپنے شاگردوں کی محبت، اعتماد اور حمایت حاصل رہی۔ ٹوٹے وعدے، خواب اور گھر ہمارے بچوں کو بھی تنہائی، مایوسی اور غلامی کی طرف لے جاتے ہیں۔ شائستہ جمال انوار احمد کی شاگرد ہیں اور انوار احمد کہتے ہیں کہ شائستہ جمال ہو یا ملالہ یوسف زئی، ان کی کٹھنائیوں کی کہانی مختصر تو نہیں ہو سکتی ہم اپنے

شاگردوں سے محبت بھرے دل اور نم ناک آنکھوں کے باوجود کبھی یہ نہیں کہتے کہ ہم آپ کی راہ میں آنے والے ہر ایک کانٹے کو چن لیں گے۔

"بے شک ٹوٹے ہوئے گھر، وعدے اور خواب ہمارے بچوں کو بھی تنہائی اور رائیگانی کے دشت میں لا پھینکتے ہیں مگر ہماری بچیوں کے لئے یہ اذیت دو گونا سہ گونا ہوتی ہے کہ عاقبت فروشوں کے دامن میں بیٹیوں کے لئے کوئی ایک وعدہ یا امید کی کرن نہیں، اہل دستار کو ہمیشہ اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ لڑکیوں کی زبان کہیں کُھل ہی نہ جائے اور ان کی گھٹی ہوئی سسکیاں تکیے بھگونے کے بجائے مردانہ برابری پر قائم اداروں کے بچے ضمیر میں خلش ہی پیدا کرنا نہ شروع کر دیں، وہ جو ہکلاتے غلاموں اور گونگی کنیزوں کی قطاروں کو سعادت کی نشانیاں خیال کرتے ہیں۔" (۳۱)

انوار احمد سیاسی اور سماجی غلامی کے مخالف ہیں وہ بچوں اور بچیوں کی آزادی کے حامی دکھائی دیتے ہیں۔ وہ رسمی رشتوں کی ریاکاری کو مٹانے کے خواہاں ہیں۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ ایک ایسی بصیرت پیدا ہو کے اس دنیا کے دکھ درد کے قابل برداشت ہو جائیں اور آنے والی نسلوں کو اتنی قیمت نہ چکانی پڑے جو پاکستان میں دو سے تین نسلیں چکا رہی ہیں۔ انوار احمد کا یہ خاکہ نہ صرف غلامی بلکہ تنہائی کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب صالحین کو پاکستان اور اہل پاکستان سے زیادہ نظریہ پاکستان کی سلامتی کی فکر تھی۔ جو چور دروازے سے اقتدار میں آنے والوں کو تاحیات ظلِ الٰہی کے درجے پر فائز کرنے کا پروانہ دے سکے۔

ج۔ انوار احمد کے خاکوں اور افسانوں میں سیاسی عناصر کے اشتراکات وافتراقات

انوار احمد سیاسی عناصر کے متعلق گہرا شعور رکھتے ہیں اس لئے ان کے ہاں دو طرح کے عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں ان میں ایک مثبت سیاسی عناصر اور دوسرے منفی عناصر۔ انوار احمد کے خاکوں اور افسانوں میں سیاسی عناصر کے

اشتراکات اور افتراقات بھی نمایاں ہیں۔ اشتراک کا مطلب دو مختلف چیزوں میں مشترک صفت کو واضح کرنا جبکہ افتراق کا مطلب دو مختلف چیزوں میں فرق کو واضح کرنا۔ اسی طرح انوار احمد کے افسانے اور خاکے بھی ان خصوصیات کے حامل ہیں افسانے میں چونکہ مختصر کہانی ہوتی ہے اور خاکے میں کسی بھی شخصیت اور اس کے کردار کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس لیے انوار احمد کے افسانوں اور خاکوں میں کچھ مثبت اور منفی سیاسی عناصر مشترک دکھائی دیتے ہیں اور اسی طرح ان کے خاکوں اور افسانوں میں کچھ منفی اور مثبت سیاسی عناصر کے لحاظ سے فرق پایا جاتا ہے۔

جیسا کہ مزاحمت ایک سیاسی عنصر ہے اور مزاحمتی رویہ انوار احمد کے خاکوں اور افسانوں میں مشترک ہے۔ لیکن اگر انوار احمد کے افسانوں اور خاکوں میں مزاحمتی رویے کے افتراق کو مد نظر رکھا جائے تو اس میں فرق یہ ہے کہ افسانوں میں انوار احمد نے علامتی اسلوب میں مزاحمت کی ہے لیکن خاکوں میں مزاحمت کی نوعیت مختلف ہے۔ اس میں انوار احمد نے علامتی اسلوب کی بجائے واضح اور کھلے عام الفاظ میں مزاحمت کو قاری کے سامنے لایا۔ انوار احمد کے افسانوں میں مزاحمتی رویے کے لیے اقتباس پیش نظر ہے جس میں انہوں نے علامتی اسلوب میں مزاحمت کی۔ انوار احمد کا افسانہ ''ایک ہی کہانی'' مزاحمتی رویے کی نمائندگی کرتا ہے۔

> ''اور لوگ تھے کے ساحل کو محفوظ جان کر اپنے لیے خندقیں اور قبریں کھود رہے تھے اور ادھر وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ کنارے پر جان دینے کی بجائے سمندر میں خنجر کی طرح اتر جائے گا اس کے مد مقابل رات بھی تھی سمندر بھی اور ناعاقبت اندیش ساتھی بھی۔'' (۳۲)

> ''زیادہ دردناک یہ ہے کہ مارشل لاء کے سائے میں، جماعت اسلامی کے ایک، متفق خان بابا احمد خان درانی کی وساطت سے ملتان کے ایک صالح، پرچون فروش کے سامنے اپنے نظریات کی وضاحتیں کرتے اور حب وطن اور اسلام سے وفاداری کے دستاویزی ثبوت پیش کرتے دیکھا۔'' (۳۳)

اوپر والا اقتباس انوار احمد کے افسانے سے لیا گیا ہے جس میں مزاحمت علامتی انداز میں کی جارہی ہے کہ کچھ لوگ سمندر کے ساحل کو محفوظ سمجھ کر اپنے لئے قبریں کھود رہے تھے اور ان میں سے ایک ایسا شخص بھی تھا جس نے ساحل کو محفوظ جانے کی بجائے سمندر میں ڈوب جانے کو ترجیح دی۔ یہاں واضح ہے کہ مارشل لاء جبر و تشدد کے دوران کچھ لوگ ایسے تھے جنھوں نے عسکری نظام حکومت کے خلاف مزاحمت کی لیکن وہ یہ مزاحمت کھلے عام نہیں کر سکتے تھے ان میں ایک انوار احمد بھی ایسے ادیب تھے جنھوں نے دیگر ادیبوں اور عوام کی طرح علامتی اور استعاراتی انداز میں مزاحمت کو نمایاں کیا۔ افسانہ "ایک ہی کہانی" کے پس منظر میں مارشل لائی جبر واستحصال کو بیان کیا گیا ہے کہ کچھ لوگوں نے عسکری نظام حکومت کو خوشی سے قبول کر لیا لیکن کچھ نے مزاحمتی رویہ اختیار کیا۔

دوسرا اقتباس انوار احمد کے خاکے سے لیا گیا ہے اس میں خان بابا احمد درانی کھلے اور واضح الفاظ میں مارشل لاء کے جبر واستحصال کی کہانی اور عسکری نظام حکومت کے خلاف ایک پرچون فروش کے سامنے اپنے نظریات کو پیش کرتے ہیں اور وطن کے لیے اس نے جو قربانیاں دیں اس کو بھی بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح احتجاجی رویہ بھی انوار احمد کے خاکوں اور افسانوں میں مشترک ہے۔ لیکن احتجاج کا عنصر ان کے خاکوں افسانوں میں واضح الفاظ میں ہیں اس میں انوار احمد نے کسی طرح کا بھی استعاراتی یا علامتی اسلوب اختیار نہیں کیا بلکہ دونوں میں کسی طرح کا افتراق نہیں ہے۔ انوار احمد "گونگی غراہٹ "ان کا ایک افسانہ ہے اس میں انہوں نے ایک فقیر کے احتجاجی رویے کو بیان کیا ہے۔ کہ فقیر سکے لینے کی بجائے احتجاج کا مظاہرہ کرتا ہے اور سکے نالی میں پھینک دیتا ہے۔ اور اسی افسانے کا مرکزی کردار بھی بے بس اور مجبور لوگوں کے حقوق کے لیے احتجاج کی آواز کو بلند کرتا ہے۔

اسی طرح انوار احمد نے اپنے نانا کی شخصیت پر خاکہ تحریر کیا اس میں بھی احتجاجی رویہ نظر آتا ہے وہ اپنے نانا کے متعلق لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی تمام عمر تقریباً احتجاج کا مظاہرہ ہے کیا۔ یہاں انوار احمد نے جس طرح افسانے

میں واضح اسلوب میں احتجاج کو بیان کیا اسی طرح خاکے میں بھی واضح اسلوب ہی نمایاں ہے ڈھکے چھپے الفاظ میں بات نہیں کی۔

"اپنے بچپن سے ہی میں نے انہیں احتجاجی اشتہار لکھتے دیکھا، میرے نانا کے والد حاجی برخودار نے شاید قاضی مٹو کی خانقاہ بنائی تھی ہمارے نانا اس خانقاہ کے متولی کے خلاف تھے کافی سارے گدی نشین اور متولی قبرستان اور وقف املاک بیچ رہے تھے نانا جی کے بیشتر اشتہار انہی کے خلاف تھے۔" (۳۴)

اب یہاں ان اقتباس میں جس طرح فقیر اور انوار احمد کے نانا نے احتجاج کیا۔ خاکے اور افسانے میں احتجاج کی نوعیت ایک جیسی ہے۔ انوار احمد کے افسانوں میں تقریباً ایک وقت میں ایک عنصر نمایاں نظر آتا ہے لیکن ان کے خاکوں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ بیک وقت ان کے خاکوں میں ایک سے زیادہ سیاسی عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ایک خاکے میں ناانصافی کو بیان کیا گیا ہے تو اسی خاکے میں ترقی پسندی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کی مثال اگر بیان کی جائے تو انوار احمد نے "بے نظیر بھٹو سے خلقِ خدا کا انمٹ لگاؤ" حاکم میں یہ بذات دیکھنے کو ملتی ہے اب اس افسانے میں ایک سے زیادہ عنصر نمایاں ہیں جس میں مثبت اور منفی دونوں عناصر شامل ہیں۔ اس خاکے میں ایک ہی وقت میں بدعنوانی، امید، جبر تشدد اور مزاحمت دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ان کے افسانوں میں ایسا نہیں ہے بلکہ ان کے افسانوں میں ایک وقت میں ایک ہی عنصر دیکھنے کو ملتا ہے۔

"پاکستان کے عسکری ڈکٹیٹروں اور ایجنسیوں نے پاکستانی عوام کے خوابوں اور امنگوں کو جس بے رحمی سے کچلا ہے اس کے ملبے میں دبے ہوئے نہتے لوگوں نے اس لڑکی سے نظام کو بدلنے کی جو توقع قائم کر رکھی ہے کیا وہ پوری ہو گئی۔" (۳۵)

"سیاستدانوں کو بدعنوان اور جھگڑالو ثابت کر کے پھر وردی میں ملبوس ہو کر پاکستانی عوام سے اگلے دس برس پر محیط ایک ہی خطاب کیا جاتا تھا "میرے عزیز ہم وطنو! ہم نے آپ کو جمہوریت

اور سیاست کے پُر فریب اور بد عنوان چنگل سے آزاد کر کے آپ پر براہ راست حکومت کرنے کا خوشگوار فیصلہ کیا ہے۔" (۳۶)

یہاں اس خاکے کے دو اقتباس کو شامل کیا ہے جس میں خاکے کے پہلے حصے میں پاکستانی عوام کے دلوں اور دماغوں میں ایک امید تھی لیکن عسکری ڈکٹیٹروں اور ایجنسیوں نے اس امید کو کچل کر رکھ دیا اور ساتھ ہی اسی خاکے میں بد عنوانی اور جبر و تشدد کو بھی انوار احمد نے واضح کیا ہے کہ مارشل لاء سے پہلے والی حکومت کے سیاستدانوں کو بد عنوان اور جھگڑالو ثابت کر کے ان کو اقتدار سے ہٹانا اور خود حکومت کرنا اور لوگوں کو یہ امید دلانا کے ہم آپ کو جمہوریت اور سیاست کے فریب اور بد عنوانی سے بچانا چاہتے ہیں۔ اگر افسانے کے حوالے سے دیکھا جائے تو "درداں دی ماری دلڑی علیل اے" یہ صورتحال کی نمائندگی کرتا ہے کہ اس پورے افسانے میں صرف اور صرف امید عنصر سے ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ انوار احمد نے جتنی بھی شخصیات کی خاکے تحریر کیے وہ سب حقیقت پر مبنی، کھر درے اور انتہائی دلچسپ ہیں۔ انوار احمد نے سماج کے تمام موضوعات کو اپنی تحریروں میں شامل کیا جرات مندانہ اسلوب آپ کے خاکوں کی ایک نمایاں خوبی ہے کہ جس طرح آپ نے اپنے افسانوں میں علامتی رویہ اپنایا اس کے برعکس آپ نے انتہائی بہادری سے جن شخصیات کے خاکے لکھے ان کی شخصیت کے تمام مثبت اور منفی پہلو پر بھی روشنی ڈالیں۔ انوار احمد نے ہر شخصیت کی ذاتی خوبیوں اور خامیوں کو مخصوص الفاظ میں بیان کیا۔

انوار احمد کے خاکوں اور افسانوں میں ایک فتراق یہ بھی ہے کہ آپ کے افسانے انتہائی مختصر ہیں جبکہ خاکے انتہائی طویل ہیں۔ اس کے علاوہ ایک افتراق یہ بھی ہے کہ آپ کے افسانوں میں مزاحمت اور جبر و تشدد کا عنصر زیادہ ہے لیکن آپ خاکوں میں روشن خیالی اور ترقی پسندی پر ایک طویل بحث دیکھنے کو ملتی ہے۔

"ضیاء کے دور میں ہی ترقی پسند اور روشن خیال اساتذہ اور طالب علموں کو جس طرح شاہی قلعے، جیل، تفتیش اور دور دراز مقامات کے تبادلے اور صالحین کو فتووں کا سامنا کرنا پڑا اس

سے ہماری نسل کے لوگوں کو ترقی پسند دانشوروں، صحافیوں اور کارکنوں سے از سر نو
متعارف ہونے کا موقع ملا۔" (۳۷)

انصاف پسندی کے موضوع پر اگر بات کی جائے تو یہ عنصر بھی انوار احمد کی نثر میں مشترک ہے کیونکہ ان کے خاکوں اور افسانوں میں انصاف پسندی کی نوعیت ایک جیسی ہے۔ انوار احمد نے اپنے افسانوں میں عدالت میں انصاف نہ ملنے پر آواز اٹھائی اور اس کے لیے انہوں نے کسی طرح کا استعاراتی یا تمثیلی طریقہ نہیں اپنایا اور بالکل اسی طرح ان کے خاکوں میں بھی انصاف پسندی اور عدالتی معاملات میں ناانصافی کو اہمیت حاصل ہے۔" کمال بستی جیڑا چوک" بھی ایک ایسا افسانہ ہے جس میں وہ شخص جس کو ملزم قرار دیا جاتا ھے وہ اس امید اور آس پر جی رہا ہوتا ہے کہ ایک دن عدالت اس کے حق میں فیصلہ سنائے گی مگر وہ یہ امید لے کر دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے مگر اس کو انصاف نہیں ملتا۔

" وہ گھٹنوں کے بل جھک گیا اور دردناک انداز میں کراہنے لگا میں ساری زندگی ہی زیر
تفتیش رہا، میرے آقا، یہ دیکھو حلف توڑنے والوں نے میرا ہر ناخن، گوشت سے جدا کر دیا
ہے، چوری کی ہوئی بجلی سے میرے جسم کے نازک حصوں کو جھٹکے دیئے گئے ہیں اور منشیات
کے تاجروں نے مجھے اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ میں اس ساری تزلیل کو
اپنی تقدیر سمجھ لوں، نہیں اور تفتیش نہیں، بس وہی فیصلہ سنا دو جو تم نے تفتیش سے پہلے
لکھا ہوا ہے۔" (۳۸)

"جس معاشرے میں جج سے لے کر جلاد تک اپنی اولاد کو نائب تحصیلدار بنوا کر کامرانی سے
سرشار ہوتے ہیں وہاں متوسط طبقے کی غرض مندی خوشامد، خوف اور حرص کا ایسا غلیظ جلا بنتی ہے
کہ عالم و دانشور کہلانے کا شائق اس میں الٹا لٹکا رہتا ہے کہ اسے قلابازیاں کھانے میں سہولت ہو
۔" (۳۹)

اسی طرح آزادی اظہار کی پابندی بھی ایک سیاسی عنصر ہے۔ آزادی ہر شخص کا ذاتی حق ہے چونکہ مارشل لاء میں عوام کے اظہار رائے پر بھی پابندی عائد کر دی گئی تھی تو اس موضوع کو انوار احمد نے اپنے خاکوں اور افسانوں میں جگہ دی۔ اس لحاظ سے ان کی نثر میں یہ عنصر بھی مشترک ہے۔ لیکن آزادی اظہار جیسا موضوع انوار احمد کے افسانوں میں ان کے خاکوں کی نسبت زیادہ ہے۔ انوار احمد کا افسانہ ''شہر کا پہلا محب وطن بچہ'' آزادی اظہار کی پابندی کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے افسانے میں ایک ایسے کردار کو بیان کیا گیا ہے جو اس وجہ سے بھری دنیا میں اکیلا ہو گیا کہ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ملک میں ہونے والی بدعنوانیوں اور انصافیوں کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ پورے شہر میں اکیلا ہو گیا ہر گھر کا دروازہ اس پر بند کر دیا گیا۔

> ''ناچار وہ درختوں اور پرندوں سے باتیں کرنے لگا۔ پھر یہ ہوا کہ سارے درخت ایک ایک کر کے کٹنے اور تمام پرندے دو، دو، چار کی ٹکڑوں میں پکڑے جانے لگے۔ اب پھر وہ اس الجھن میں گرفتار تھا کہ نہ بولنے کا فیصلہ کرے تو سوچنے کا سزاوار ہو۔ اور اگر بولے تو کس سے؟ تنگ آکر اس نے خسرو کی ستار کے ٹوٹے ہوئے تارے سے اپنی زبان کاٹ لی۔'' (۴۰)

انوار احمد کے افسانوں کا آغاز کچھ اس طرح سے ہوتا ہے کہ ایک بار کے مطالعے سے سمجھنا مشکل ہوتا ہے جبکہ ان کے خاکوں کی خوبی یہ ہے کہ ان کو پڑھنے سے شخصیت کے تمام پہلوؤں واضح ہو جاتے ہیں۔ انوار احمد کے افسانے علامتی انداز میں ہیں جبکہ ان کے خاکے واضح اور سادہ الفاظ میں ہے۔ انوار احمد کے خاکوں میں سیاست زیادہ نمایاں ہے آپ نے جس شخصیت کا بھی خاکہ تحریر کیا اس کی سیاست سے محبت اور نفرت کو بھی زیر بحث لایا۔ گویا یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انوار احمد کی نثر یعنی خاکوں اور افسانوں میں اشتراکات زیادہ ہیں جبکہ افتراقات کم ہیں کیونکہ تمام سیاسی عناصر چاہے وہ مثبت ہو یا منفی وہ انوار احمد کی کے خاکوں اور افسانوں میں مشترک ہیں۔ انوار احمد کسی بھی اسلوب میں خاکہ یا افسانہ لکھیں لیکن بنیادی موضوعات پاکستانی معاشرت سیاست سے ماخذ ہیں اور ان کی فکر کا تانا بانا ملکی صورتحال کی رنگارنگی سے ہی تیار ہوتا ہے۔

انوار احمد نے افسانوں اور خاکوں میں سیاسی بد عنوانی پر بھی بحث کی ہے سیاسی بد عنوانی سے مراد دراصل حکومتی اہلکاروں کا طاقت کا غلط استعمال کرنا ہے کرپشن کا لفظ بھی بد عنوانی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور بد عنوانی کا لفظ آج کل سیاست میں زیادہ استعمال ہو رہا ہے ہر طرف بد عنوانی کی جڑیں پھیل چکی ہیں۔ بد عنوانی کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ یہ لا علاج مرض بن چکی ہے تو غلط نہ ہو گا۔ بد عنوانی کا اصل مطلب ناجائز ذرائع سے روز گار کمانا ہے۔ جس طرح انوار احمد نے اپنے افسانوں اور خاکوں میں مثبت سیاسی عناصر کو بیان کیا ہے بالکل اسی طرح انہوں نے اپنے خاکوں اور افسانوں میں منفی سیاسی عناصر کو جگہ دی ہے۔ انوار احمد کے ہاں منفی عناصر میں جبر و تشدد ناانصافی زبان کی پابندی لا قانونیت جیسے عناصر شامل ہیں اور اس طرح کے ظلم و ستم عوام پر سیاسی پارٹیوں کی جانب سے کیے جاتے ہیں۔ اب جس طرح انوار احمد کا افسانہ جس کا عنوان شہر کا پہلا محب وطن بچہ ہے اس کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس افسانے میں ایک بچے کی اپنے ملک و وطن سے محبت کو بیان کیا جارہا ہے۔ افسانے کے اس کردار پر سیاسی جبر تشدد کیا جاتا ہے لیکن اس افسانے میں انوار احمد نے علامتی انداز اپنایا ہے۔

اس افسانے میں انوار احمد ایک گنجان آباد شہر کا ذکر کرتے ہیں اگرچہ وہ گنجان آباد شہر کی بات تو کر رہے ہوتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ اس گنجان آباد شہر کا نام کیا ہے۔ مگر یہ شہر مسلسل چھ ہزار برسوں سے آباد ہے۔ گنجان آباد شہر معاشرتی طور پر خود کفیل بھی ہے اسی طرح ان کے افسانوں میں اکثر جگھوں پر تنہائی کے احساس کو محسوس کیا جاتا ہے اور تنہائی کا احساس ان کے افسانے آسٹر وٹرف میں واضح طور پر موجود ہے ایک ایسا شخص جس کے دو بیٹے ہونے کے باوجود بھی وہ تنہا رہتا ہے۔ اس بوڑھے شخص کا بیٹا باپ کو سہارا دینے کی بجائے باپ کو دوسری شادی کا مشورہ دیتا ہے یا پھر باپ کو کہتا ہے کہ آپ کو ڈش انٹینا لگوا دیتا ہوں آخر آپ نے کسی سہارے تو زندگی گزارنی ہے۔ جس پر بوڑھا شخص بیٹھ کر یہ سوچتا ہے کہ اس کے بیٹے نے یہ جملے محبت میں کہے تھے یا نفرت میں، طنز کیا تھا یا دلاسہ دیا تھا۔

انوار احمد کے زیادہ تر افسانے معاشرتی وسیاسی مسائل کی عکاسی کرتے ہیں ان کی تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنی زندگی کو اپنی مرضی سے گزارنے کا حق حاصل ہے تو پھر ان لوگوں پر زبردستی کیوں کی جاتی ہے۔ کیونکہ ہر شخص تبدیلی کا خواہاں ہوتا ہے پہلے سے سنی ہوئی کہانی میں ایک کردار کو اگر دیکھا جائے تو وہ بھی روز روز ایک ہی کہانی سن کے تھک جاتی ہے وہ چاہتی ہے کہ اسے روز ایک نئی کہانی سنائی جائے۔ انوار احمد کے افسانوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے افسانوں میں کہیں کہیں قرآنی آیات اور ان کے ترجمے کی بھی جھلک دیکھائی دیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک بات یاد رکھو کہ مومن کی نشانی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہو اور تحقیق، عزت وذلت، حیات اور موت منجانب اللہ ہیں ہمارا کام توبہ استغفار کرنا ہے۔

انوار احمد نے چونکہ عسکری نظام حکومت کا قریب سے مشاہدہ کیا تو اس لیے ان کے افسانوں کے اکثر کردار فوجی ،افسر، سمگلر، سرکاری افسر اور تاجر ہوتے ہیں۔ انوار احمد اگرچہ ایک تلخ حقیقت نگار ہیں وہ اکثر طنزیہ جملوں کے تیر چلاتے ہیں مگر طنز کی یہ شدت اور تلخی کہانی کے حسن اور افسانے کے فنی رموز کی بدولت قابل برداشت ہو جاتی ہے۔ یہی انوار احمد کا کمال ہے کہ وہ اپنے ہدف کو نشانہ بناتے ہوئے نفرت، غصے اور دکھ کے عالم میں بھی فن کے تقاضوں کو قربان نہیں کرتے۔ انوار احمد اپنے افسانوں میں کہیں جگہوں پر عالمی قوتوں کی سازشوں کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں نیو ورلڈ آرڈر کے نفاذ کے لیے عالمی طاقتوں کے حربے اور پاکستان کی کٹھ پتلی حکومتوں کے رویے اور ان دونوں کی طرف سے مذہب کے نام پر سادہ لوح عوام کا جذباتی استحصال وغیرہ سب ان کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔

حلفیہ بیان بھی ایک ایسا افسانہ ہے جس میں انوار احمد نے ملک کی سیاسی وسماجی صورتحال کو بیان کیا ہے افسانے کا کردار محمد سلیم ایک علامتی کردار ہے جس کے مقدر میں تکلیف اٹھانا، ذلت برداشت کرنا اور بار بار گم ہونا ہی لکھا ہے پاکستانی عوام کے نمائندہ اس کردار کا نصیب بے روزگاری، بدحالی، اور اغوا ہونا ہی ہے فیکٹری کا مالک اس کا استحصال کرتا ہے اس افسانے میں ایک کردار میاں صاحب وہ طاقت اور نادیدہ ہاتھ کی علامت ہے جو

معاشرے میں غربت، دہشت گردی، منشیات اور جرائم وغیرہ کا ذمہ دار ہے۔ مگر اس پر کوئی آنچ نہیں آتی ہے وہ باعزت ہر طرف منڈلا رہا ہوتا ہے۔ انوار احمد کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ترک معاشرت کے پس منظر میں افسانہ لکھ رہے ہوں یا کسی اور ملک کے مگر ایک سچے فن کار کی طرح اپنے وطن اور معاشرے سے کبھی فراموش نہیں ہوتے ہیں۔ ان دوسرے ممالک میں رہتے ہوئے بھی اپنے ملک کی معاشی و سیاسی بدحالی اور تعلیمی نظام اور اخلاقی پستی وغیرہ کو بیان کر رہے ہوتے ہیں۔

جس طرح انوار احمد کے افسانوں میں تمام موضوعات ملتے ہیں بالکل اسی طرح ان کے خاکوں میں بھی تمام معاشرتی موضوعات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انہوں نے اپنے خاکوں میں ضیاالحق کے زمانے میں شاہی قلعے کی صعوبتیں برداشت کرنے والوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اور اس کے علاوہ ایوبی آمریت کے خلاف تحریک کے جو آثار موجود تھے اور اس وقت کے سیاسی اور سماجی انقلاب کو بھی بیان کیا۔ انوار احمد نے اپنے خاکوں میں ان شخصیات کا بھی ذکر کیا جو سیاسی صورتحال پر جذباتی اور مبالغہ آمیز کالم لکھتے ہیں انوار احمد کے بیشتر دوست احباب پٹھانوں کی طرح سیاسی طور پر قدامت پرستانہ خیالات رکھتے تھے۔ اوران کے کہیں دوست احباب ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف تحریک میں شامل ہو کر جیل بھی چلے گئے تھے۔ انوار احمد بھٹو کی پھانسی پر اتنے غمزدہ اور دکھی ہوئے کہ انہوں نے ایک افسانہ لکھا جس کا عنوان درد اں دی ماری دلڑی علیل اے ہے۔ ان کا یہ افسانہ پڑھ کر انسان کافی جذباتی ہو جاتا ہے اور یوں لگتا ہے کہ فضا سوگوار ہو گئی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ انوار احمد، داکٹر، شہر کا پہلا محب وطن بچہ، مجموعہ پہلے سے سنی ہوئی کہانی، بیکن ہاؤس ملتان، ۲۰۰۳ء ، ص ۴۰

۲۔ ایضاً، ص ۴۱

۳۔ ایضاً، ص ۴۱

۴۔ انوار احمد، ڈاکٹر، شہر کا پہلا محب وطن بچہ، مجموعہ آخری خط، ۲۰۱۰ء، مثال پبلشرز فیصل آباد، ص ۲۴

۵۔ ایضاً، ص ۲۵

۶۔ انوار احمد، ڈاکٹر، شہید کا خواب، مجموعہ پہلے سے سنی ہوئی کہانی، بیکن بکس لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۹۷

۷۔ ایضاً، ص ۹۸

۸۔ ایضاً، ص ۹۷

۹۔ ایضاً، ص ۹۹

۱۰۔ انوار احمد، ڈاکٹر، بیچ والا آدمی، آخری خط، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۶۱۔۶۲

۱۱۔ انوار احمد، داکٹر، درداں دی ماری دلڑی علیل اے، آخری خط، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۲۹

۱۲۔ انوار احمد، ڈاکٹر، دعا کی تلاش، مجموعہ پہلے سے سنی ہوئی کہانی، بیکن ہاؤس ملتان، ۲۰۰۳ء، ص ۹۱

۱۳۔ ایضاً، ص ۹۲

۱۴۔ ایضاً، ص ۹۲

۱۵۔ ایضاً، ص ۹۳

۱۶۔ انوار احمد، ڈاکٹر، بچھوؤں کے ساتھ رات، پہلے سے سنی ہوئی کہانی، بیکن ہاؤس ملتان، ۲۰۰۳ء، ص ۵۷

۱۷۔ ایضاً، ص ۵۵

۱۸۔ انوار احمد، ڈاکٹر، کریم ملک۔۔۔ مستاجری پر دیا ہوا ایک کھیت، یاد گار زمانہ ہیں جو لوگ، مثال پبلشرز فیصل آباد،

، ۲۰۱۵ء، ص ۲۱۲

۱۹۔ انوار احمد، داکٹر، فخز بلوچ عباس۔۔۔ نہ نغمہ باقی نہ شادیانے، یاد گار زمانہ ہیں جو لوگ، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۱۰۸

۲۰۔ انوار احمد، داکٹر، ملتان شہر یست نواح ارشد ملتانی، یاد گار زمانہ ہیں جو لوگ، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۷۰

۲۱۔ ایضاً، ص ۷۲

۲۲۔ انوار احمد، داکٹر، ڈاکٹر احمد بختیار اشرف۔۔۔ ایک خوش لباس اور خوش خیال ترک، یاد گار زمانہ ہیں جو لوگ، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۴۸

۲۳۔ انوار احمد، ڈاکٹر، ہمارا پیو، اصغر ندیم سید۔۔۔ ایک شاعر کی واپسی، یاد گار زمانہ ہیں جو لوگ، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۶۱

۲۴۔ ایضاً، ص ۶۱

۲۵۔ ایضاً، ص ۶۲

۲۶۔ ایضاً، ص ۶۳

۲۷۔ انوار احمد، ڈاکٹر، فرمان فتح پوری۔۔۔ اُردو علم وادب کا ایک رومانوی کردار، یاد گار زمانہ ہیں جو لوگ، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۱۱۴۔۱۱۵

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۱۵

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۱۶

۳۰۔ انوار احمد، ڈاکٹر، شائستہ جمال!" اگلے جنم، موہے بٹیا ہی کیجیو، یاد گار زمانہ ہیں جو لوگ، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۲۳۱

۳۱۔ ایضا، ص ۲۳۲

۳۲۔ انوار احمد، ڈاکٹر، ایک ہی کہانی،، پہلے سے سنی ہوئی کہانی، بیکن ہاؤس ملتان، ۲۰۰۳ء، ص ۵۱

۳۳۔ انوار احمد، ڈاکٹر، عرش صدیقی، شعور وادراک کے پر چارک جذباتی انسان، یاد گار زمانہ ہیں جو لوگ، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۳۸

۳۴۔ انوار احمد، ڈاکٹر، حضرت بنام حسین بخش، یاد گار زمانہ ہیں جو لوگ، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۲۰

۳۵۔ انوار احمد، ڈاکٹر، بے نظیر بھٹو سے خلق خدا کا انمٹ لگاؤ،، یاد گار زمانہ ہیں جو لوگ، مثال پبلشرز فیصل آباد ، ۲۰۱۵ء، ص ۲۲۲

۳۶۔ ایضاً، ص ۲۲۲

۳۷۔ انوار احمد، ڈاکٹر، حمید اختر سپاہ دانش کا بہادر سپاہی، مجموعہ یاد گار زمانہ ہیں جو لوگ، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۲۹۷

۳۸۔ انوار احمد، ڈاکٹر، کمال بستی، جبڑا چوک،، آخری خط، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۶۶

۳۹۔ انوار احمد، ڈاکٹر، پروفیسر خلیل صدیقی! میری محبوب شخصیت،، یاد گار زمانہ ہیں جو لوگ، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۳۴

۴۰۔ انوار احمد، ڈاکٹر، شہر کا پہلا محب وطن بچہ، مجموعہ پہلے سے سنی ہوئی کہانی، بیکن ہاؤس ملتان، ۲۰۰۳ء، ص ۴۱

باب چہارم

مجموعی جائزہ

اردو ادب کی تاریخ سے لے کر آج تک جتنے بھی لکھنے والے ادیب یا شاعر ہیں چاہے وہ شاعری ہو یا نثر دونوں میں ملکی حالات چاہے وہ سیاسی، معاشی و معاشرتی اور مذہبی ہی کیوں نہ ہوں سب کو بڑے احسن طریقے کے ساتھ تحریروں کا حصہ بنایا قیام پاکستان سے پہلے ہمیں انگریزوں اور ہندوؤں کی غلامی کا سامنا رہا۔ مسلمانوں کو ان دو قوموں نے ہمیشہ ظلم و ستم کا نشانہ بنایا اور اپنے مفادات کے لیے ان کا ستعمال کیا۔ مسلمانوں پر طرح طرح کے ظلم و ستم ڈھائے گئے۔ ایک الگ وطن کے قیام کے لیے مسلمانوں نے بڑی قربانیاں دیں تب جا کر ہم ایک الگ وطن حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ علیحدہ طن کے قیام کے بعد کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنے ملک و قوم کے لیے بہت سی جدوجہد کی جنھوں نے عوام کی فلاح و بہبود کا خیال رکھا مگر ان میں کچھ ایسی سیاسی پارٹیاں بھی تھیں جنہیں عوام کی نہیں بلکہ اپنی سیاست شان و شوکت اور عہدوں کی فکر تھی ایسے لیڈروں اور لوگوں نے عوام کے جذبات کو کچل ڈالا۔

کسی بھی ملک کی حکومت میں شامل انتظامیہ کے پیشہ ور عہدیدار یعنی بیوروکریٹ روزمرہ کے کاروبار چلاتے ہیں۔ سیاست دان ملک کی اہم ضروریات کی نشان دہی کرتے اور عوامی پالیسی کی تشکیل کرتے ہیں۔ آزادی کے بعد مسلمانوں یعنی عوام کو یہ توقع تھی کہ برتری کے احساس کو ختم کر کے عوام کی خدمت کی جائے گی لیکن نوآبادیاتی اثر حکمرانوں میں سے کبھی نہ ختم ہوا۔ کچھ ظلم و تشدد عوام پر مارشل لائی حکومتوں نے بھی کیے پاکستان کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے آئین کو تشکیل دینے کے سلسلے میں ایک بار یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ اس ملک میں مارشل لاء کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیں گئے مگر وقت کی ستم ظریفی یہ ہے کہ مارشل لاء کی حکومت نے انہیں پھانسی دے دی۔ مطلب یہ کہ جو حکمران عوام کی بھلائی اور حقوق کی بات کرتا ہے اس کو دفن کو دیا جاتا ہے۔ ہماری زندگیاں سیاست سے محفوظ نہیں ہیں سیاست کا ہماری زندگی میں اتنا عمل دخل ہے کہ اس سے محفوظ رہنا ممکن نہیں ہے۔ سیاست ادب و فن میں کسی جگہ ترقی پسندی اور کسی جگہ رجعت پسندی کی صورت میں موجود ہے۔ ادب ہمیشہ اپنے ماحول، اس کی اقدار، اپنے معاشرے اور اس کے کلچر کا اظہار ہے۔ حقیقت پر مبنی ادب نظریاتی جہت، ثقافت اور سیاست کی بدولت ہی وجود میں آتا ہے کوئی بھی ادیب سیاست کو ایک طرف رکھ کر ترقی نہیں کر سکتا ہے اور ہمارے عہد کا تقاضا بھی یہ ہی ہے کہ ادبی تحریروں میں سیاسی مسائل کو ضرور جگہ دی جائے تاکہ انتشار پسند قوتیں انقلاب کے نام پر انسانیت سے نہ کھیل سکیں۔ کچھ ادیب ایسے بھی ہے جن کی تحریروں میں سیاسی عناصر شعوری طور پر موجود ہے لیکن کچھ ادیب اور شاعر ایسے بھی ہیں جن کی تحریروں میں سیاست لاشعوری طور پر پائی جاتی ہے۔ انسان کو آزاد پیدا کیا ہے اس لئے آزادی انسان کا بنیادی حق ہے اور اس حق کو انسان سے چھیننے کا اختیار کس کو نہیں دیا گیا۔ انسان کی ذاتی عزت و حرمت اور مساوی و نا قابل انتقال حقوق کو تسلیم کرنا دنیا میں آزادی انصاف اور امن کی بنیاد ہے۔

اظہار کی آزادی کے لئے ہر دور میں لاکھوں لوگوں نے قربانیاں دیں اس سے زیادہ اس کی مثال ہمارے ملک پاکستان کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے جنہوں نے ہندوؤں اور انگریزوں کی غلامی سے انکار کر کے ایک الگ اور آزاد ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا اور ایک الگ وطن حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے مگر اس کے لیے بہت سی قربانیوں اور جدوجہد کی گئی۔ منشی پریم چند جن کو پہلا افسانہ نگار قرار دیا جاتا ہے انہوں نے اپنا افسانوی مجموعہ سوز وطن تحریر کی حکومت کی جانب سے ان پر پابندی لگا دی گئی کہ اس افسانوی مجموعے سے بغاوت کی بو آتی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ آزادی اظہار کے مسائل پاکستان کے قیام کے بعد عسکری نظام حکومت کے دور میں پیش آئے۔ ۱۹۵۷ کا مارشل لا اور اس کے بعد یحییٰ خان سقوط ڈھاکہ ایسے المیے تھے جس کی بنا پر آزادی اظہار کے مسائل سامنے آئے۔ اس دور کی تحریروں میں جو موضوعات سامنے آئے ان میں آزادی عدم تحفظ عدم شناخت جمہوریت ریاستی جبر بغاوت لا قانونیت وغیرہ شامل ہیں۔ ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دور میں مزاحمتی ادب نے نشوونما پائی ادیبوں کو کوڑے مارے گئے اور ان کو ملازمتوں سے نکال دیا گیا۔ ہر شخص کو رائے رکھنے اور آزادی اظہار کا حق حاصل ہے۔ آزادی اظہار انسان کا سیاسی اور امتیازی حق ہے اس کے بغیر انسان کے دوسرے حقوق خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔

جو شخص آزادی اظہار کو اپنانا چاہتا ہے وہ نہ تو کسی کے دباؤ میں آنا پسند کرتا ہے اور نہ ہی خاموش رہنا اور نہ ہی وہ جھوٹی بات کرنا پسند کرتا ہے۔ ۱۹۷۱ ء میں جب مشرقی پاکستان الگ ہوا تو یحییٰ خان نے اقتدار ذلفقار علی بھٹو جو پیپلز پارٹی کے چیئرمین تھے ان کے حوالے کر دیا اور مارشل لا کو اٹھا لیا گیا۔ مارچ ۱۹۷۷ عام انتخابات ہوئے۔ انتخابات میں دھاندلی کے نتیجے میں پورے ملک نے میں نے ہر طرف ان کاموں اور احتجاج کا سلسلہ شروع ہو گیا ملک میں احتجاجی تحریک چلائی تھی جیسے ملک کی اندرونی سلامتی کو خطرہ لاحق ہوا۔ ملک میں ہر طرف ہنگاموں اور احتجاج کا سلسلہ شروع ہو گیا اور کچھ سیاسی جماعتوں نے اس کا فائدہ اٹھایا فوج کے سربراہ ضیا الحق نے مارشل لاء لگا کر اقتدار پر قبضہ کر لیا اور ذوالفقار علی بھٹو کو حراست میں لے لیا گیا احتجاجی تحریک کو بڑی بے دردی سے پاؤں تلے کچلا گیا۔ جبر و تشدد کے ہر حربے کو آزمایا گیا۔ فوجی عدالتیں قائم کی گئیں صحافت

اور ادب سے تعلق رکھنے والے دانشوروں کو کوڑے مارے گئے اسی دور میں مزاحمتی ادب کا آغاز ہوا اور اس کا آغاز اعجاز راہی نے کیا۔

انوار احمد کا جدید افسانے میں ایک اہم نام ہے۔ان کے افسانوں میں سماجی، ثقافتی اور سیاسی جہتیں موجود ہیں ۔انوار احمد ایک باشعور اور منفرد فنکار بھی ہیں۔اس لیے ان کی بلند تر نقادانہ اور عالمانہ حیثیت نے ان کے فن کو نقصان نہیں پہنچایا بلکہ اس میں بے پناہ گہرائی اور وسعت پیدا کی۔ان کے اسلوب میں تیکھاپن ان کی تحریروں کو خوبصورت بنادیتا ہے ان کے جملے کہانی کے باہر بھی معنویت اور حُسن میں بھرپور ہیں۔انوار احمد کے افسانوں کے موضوعات معاشی سطح سے اٹھ کر سیاسی، تہذیبی مذہبی اور جغرافیائی سطح تک وسیع ہو جاتے ہیں انوار احمد کے افسانے ہماری قومی تاریخ کے ایک دور کی دستاویز ہیں۔مارشل لاء کی بنا پر تحریر وتقریر پر پابندی، فکر وفریب، انسانیت کی تذلیل، مارشل لا کے دورانیے کو بڑھانے کے حربے۔اوچھے ہتھکنڈے روشن خیالی اور سوچ کی تبدیلی کا سدباب جیسے تمام عناصر کے ذریعے حقائق کی منظر کشی کر کے ادب کا رشتہ اس عہد کی تاریخ کے ساتھ جوڑنے میں کامیاب ہوئے۔

انوار احمد قومی اتحادو یکجہتی چاہتے تھے ہندوستان کی تہذیبی زندگی کا یہ بدترین المیہ تھا کہ یکجہتی کی علامت اور قومی ہم آہنگی کی علمبردار اس زبان کو سیاسی مصلحتوں کی قربانگاہ میں شہید ہونا پڑا۔ قیام پاکستان کے بعد اردو ادب میں بہت سے موضوعات اور مسائل ورثے میں ملے مسلم لیگ کا یہ المیہ تھا کہ اس میں نئ سوچ رکھنے والے نوجوان نہیں تھے۔زبان بندی جیسے مسائل بھی سامنے آئے سیاست کا بحران اور شخصیت کی شکست وریخت سیاسی زوال اور جبر ہی کا نتیجہ ہے۔ قائد اعظم کے بعد کوئی ہیرو موجود نہیں تھا۔ قومی سطح پر کسی ہیرو کی غیر موجودگی نے بے سمتی کو جنم دیا لیکن اڑسٹھ کی دہائی عوامی تحریک نے ذالفقار علی بھٹو کی صورت میں قوم کو ہیرو دیا ایک بڑے سانحے کے بعد نئے سفر کا آغاز ہوا۔

۱۹۷۳ ءکے آئین نے ملک میں قانون کی حکمرانی کی راہ ہموار کی۔ لیکن ۱۹۷۷ ءکے مارشل لاءنے ملک کو اندھیرے میں دھکیل دیا اس مارشل لا کا اخلاقی اور قانونی طور پر کوئی جواز نہ تھا۔یہ پاکستان کی سیاست کا بدترین دور تھا اس مارشل لاءنے قومی ہیرو کو پھانسی پر لٹکا دیا تھا۔اور اس کے علاوہ سیاسی عمل کو بہتر بنانے کے لیے لسانی

مذہبی اور علاقائی تعصبات کو ہوا دی۔مارشل لاء پورے سیاسی نظام کو تباہ و برباد کر دیتا ہے سیاسی ڈھانچے کو توڑ پھوڑ کر اپنا ایک سیاسی نظام وجود میں لاتا ہے۔ ۱۹۷۷ ء کے مارشل لاء نے بھی یہ ہی کچھ کیا ملکی سیاسی صورتحال اندر سے کھوکھلی ہو گئی۔مارشل لاء میں بظاہر ادب میں سیاسی مزاحمت کے آثار کم دکھائی دیتے ہیں مگر سیاسی آزادیوں کی کمی، اقتدار کے کھوکھلا ہو جانے کی وجہ سے جبر و تشدد کے احساس نے جو ادب جنم دیا اس میں احتجاج، دکھ اور مزاحمت وغیرہ شامل ہے۔اس میں شخصی جبر بھی موجود ہے لوگوں میں خوف پیدا ہو گیا تھا خوف کی ظاہری صورت ہو یا باطنی وہ انسانی نفسیات کو متاثر کرتی ہے۔جس دور میں انوار احمد پیدا ہوئے اس دور میں بھی کچھ اسی طرح کے سیاسی حالات چل رہے تھے اس لئے انوار احمد نے اس دور کے ہر ایک واقعہ کو اپنی تحریروں میں جگہ دی۔

ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی انوار احمد کے کے دور کا ایک ایسا المیہ تھی جس کو وہ کبھی بھلا نہیں سکے۔ضیا الحق کے دور میں اساتذہ کو زبان بندی اور اس کے ساتھ ذہن اور رزق کی بندشوں کا سامنا بھی کرنا پڑا انوار احمد کہتے ہیں کہ ضیاء الحق کے دور میں ہی سفاک قاتل تیار کئے اور ان قاتلوں کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے وہ سینکڑوں ڈاکٹروں فنکاروں اور استادوں کو محض اس لئے ہلاک کر دیا ہے جن کے مثالی حسن اخلاق و دلپذیر شخصیت اور حق گو زبان کے اثرات سے ان مذہبی فاشسٹوں کی من چاہی تعبیروں کے عمل درآمد میں رکاوٹ پڑ سکتی ہے۔انوار احمد اپنے حق کو میں کہیں جگہ درس دے رہے ہوتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا جب دنیا کے ہر شہر کی طرح ہمارے ہاں بھی دو ہی طرح کے لوگ تھے ایک امیر اور دوسرے غریب تب بھی ہمارے ہاں غریبوں اور امیروں میں کئی قسم کے لوگ ہوتے تھے وہ غریب بھی جو سیر چشم ہوتے تھے جو اپنے بھوکے اور محروم بچوں کو بھی انا کا سبق پڑھاتے تھے اور چوروں اور ڈاکوؤں سے ڈرتے نہیں تھے ہمارے ملک میں ہر دس سال کے بعد ایک ایسا وقت ضرور آتا ہے جب مختلف سوال ہماری اجتماعی بقا کے حوالے سے اٹھائے جاتے ہیں جس میں کوئی ریاستی اداروں کی مربوطی، معاشی خود کفالت اور نئے قانونی اور سیاسی نظام کی بات کر رہا ہوتا ہے۔

انوار احمد نے اپنے آقا کو میں خود غرضی پر بھی اچھی خاصی بحث کی ہے وہ کہتے ہیں کہ لوگ اس قدر خود غرض ہو گئے ہیں کہ جس معاشرے میں جج سے لے کر جلاد تک اپنی اولاد کو نائب تحصیلدار بنا کر کامرانی سے سرشار کرتے ہیں وہاں متوسط طبقے کی خوشامد، خوف و حرص کا ایک غلیظ جالا بنتی ہے انوار احمد نے مشکل ترین لمحات میں بھی بدترین خود پسندوں کے سامنے سچی بات کی۔

تحقیقی نتائج

۱۔ انوار احمد کی نثر میں سیاسی شعور پر کام کرنے سے ان کی نثر میں موجود سیاسی پہلو اجاگر ہوئے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ سب سے پہلے انوار احمد کے حالات زندگی اور ان کے عہد کے سیاسی دور کا مطالعہ کیا جائے انوار احمد کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جہنوں نے سیاست کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔ انہوں نے ظلم وزیادتی ،بدعنوانی، ناانصافی اور جبر و تشدد پر شدید احتجاج کیا۔

۲۔ انوار احمد نے اپنی تحریروں میں ادب اور سیاست کے تعلق کو بڑے احسن انداز میں تحریر کیا اور یہاں تک کے گہرائی کے ساتھ منفی اور مثبت سیاسی عناصر کی وضاحت بھی کی ہے۔

۳۔ انوار احمد چونکہ درد مند دل کے مالک انسان ہیں وہ کسی بھی طرح کا ظلم و ستم ہو رہا ہو تو وہ اس کو صبر کے ساتھ برداشت کرتے ہیں لیکن عوام اور مظلوں کے ساتھ ہونے والے ظلم کا برداشت نہیں کرتے ہیں۔

۴۔ انوار احمد جب وہ معاشرے میں ہونے والے ظلم و ستم کے خلاف لاچاروں کے آنسو نہیں پونچھ سکتے تو ان کے کرب کو کم کرنے کے لیے کہانی لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔

۵۔ انوار احمد کے الفاظ اور فقروں کا چناؤ ایسا ہے کہ وہ روح کی گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے۔ اس لیے ان

کے خاکوں اور افسانوں میں سماج کے مسائل کی عکاسی دیکھائی دیتی ہے۔ وہ معاشرے کے تمام موضوعات کو اپنی تحریروں میں جگہ دیتے ہیں۔

۶۔ انوار احمد اپنے ملک اور جمہوریت کو اپنی محبوبہ سمجھتے ہیں ۱۹۵۰ میں جمہورتیوں کے انتخاب میں فیلڈ مارشل جنرل ایوب خان نے جس طرح فاطمہ جناح کو دھونس اور دھاندلی سے شکست دی تو انوار احمد نے جمہوریت کو اپنی محبوبہ کا روپ دیا اور اپنے طور پر آمرانہ ہتھکنڈوں کے خلاف احتجاج اور مزاحمت کرتے رہے۔ جب ذوالفقار علی بھٹو کا دور حکومت آیا تو عوام کو ایک منزل دیکھائی دینے لگی مگر بھٹو کی پھانسی ایک ایسا سانحہ تھا جو انوار احمد کے دل و دماغ پر گہرے اثرات چھوڑ گیا۔

۷۔ انوار احمد کے خاکوں اور افسانوں میں واضح طور پر منفی اور مثبت سیاسی عناصر دیکھے جاسکتے ہیں بعض جگہوں پر وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں سیاسی عناصر کی وضاحت کرتے ہیں۔ ۸۔ انوار احمد بعض جگہوں پر وہ صاف اور واضح الفاظ میں ملک دشمن عناصر کے خلاف احتجاج اور مزاحمت کرتے ہوئے دیکھائی دیتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں سیاسی عناصر کی وضاحت ہے بلکہ ان کے خاکوں میں بھی تمام سیاسی عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

سفارشات

اس تحقیق کے بعد سفارشات کے ضمن میں مندرجہ ذیل نکات ہیں۔

۱۔ انوار احمد کی نثر میں جدیدیت، مابعد جدیدیت اور حقیقت پسندی کے حوالے سے بھی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

۲۔ انوار احمد کی نثر کے حوالے سے قابل قدر کام موجود ہے مگر اس پر مزید کام کیا جاسکتا ہے سماجی مسائل اور ترقی پسند تحریک کے حوالے سے انوار احمد کی نثر پر کام کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ انوار احمد کے افسانوں میں علامت نگاری، بیانیہ یا داخلی خود کلامی کے حوالے سے بھی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

انوار احمد، ڈاکٹر، ایک ہی کہانی (افسانوی مجموعہ)، سنگ میل پبلشرز لاہور، ۱۹۹۴ء

انوار احمد، ڈاکٹر، پہلے سے سنی ہوئی کہانی (افسانوی مجموعہ)، اردو بازار لاہور، ۲۰۰۳ء

انوار احمد، ڈاکٹر، یاد گار زمانہ ہیں جو لوگ (خاکے)، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۰۸ء

انوار احمد، ڈاکٹر، آخری خط (افسانوی مجموعہ)، مثال پبلی کیشنز فیصل آباد، ۲۰۱۰ء

ثانوی ماخذ

انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں (ابتدا تا ۱۹۷۵ء) ، دہلی، ۲۰۰۴ء

احمد ندیم قاسمی (انٹرویو منور علی ملک)، پس دیوار، بک مارک ٹیمپل روڈ، لاہور، بار اول ۱۹۹۳ء

فرہنگ تلفظ، شان الحق حقی، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد پاکستان، طبع سوم، ۲۰۰۸ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد پاکستان، طبع اوّل ۱۹۹۴ء

وارث سرہندی، مؤلف، جامع علمی اردو لغت، علمی کتاب خانہ لاہور، طبع سوم ۲۰۰۳ء

سید احمد دہلوی، مولوی، فرہنگ آصفیہ، مرتبہ، جلد سوم، اردو سائنس بورڈ، ۱۹۸۶ء

راجندر سنگھ بیدی، ادب اور سیاست، "ادب، زندگی اور سیاست" مرتب محمد خاور نوازش، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۲ء

اعجاز حسین، ادب اور سیاست، "ادب، زندگی اور سیاست، مرتب خاور نوازش، مثال پبلشرز فیصل آباد ، ۲۰۱۲ء

ژاں پال سارتر، معاصر ادب ڈاکٹر جمیل جالبی، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء

ممتاز شریں، سیاست، ادیب اور ذہنی آزادی، مشمولہ ادب، زندگی اور سیاست، فیصل آباد، ۲۰۱۲ء

رشید امجد، ڈاکٹر، مزاحمتی ادب اردو، اکادمی ادبیات اسلام آباد پاکستان، ۱۹۹۵ء

رشید امجد، ڈاکٹر، مزاحمتی ادب اردو، اکادمی ادبیات اسلام آباد پاکستان، ۱۹۹۹ء۔۲۰۰۷ء، ۲۰۰۹ ء

احمد حسن، کرشن چندر کے سماجی اور ادبی نظریات، نئی دہلی، ۱۹۴۷ء

احمد ندیم قاسمی، تہذیب و فن، شرکت پرنٹنگ پریس لاہور، ۱۹۷۵ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، معاصر ادب (ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی، ۱۹۹۴ء

احتشام حسین، سید، تنقید اور عملی تنقید، اترپردیش اردو اکادمی لکھنو، ۲۰۰۵ء

مزمل حسین، پروفیسر ڈاکٹر انوار احمد کے افسانوں کا لسانیاتی مطالعہ، مطبوعہ انگارے ، ملتان، جولائی ۲۰۰۶ء،

شوکت نعیم قادری، نتائج فکر، بیکن ہاؤس ملتان، ۲۰۰۴ء

شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ (تحقیق و تنقید)، پورب اکادمی ادبیات، اسلام آباد، فروری ۲۰۰۸ء

اے۔بی اشرف،ڈاکٹر،کچھ نئے اور پرانے افسانہ نگار،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۸۷ء

9.Aristole,politics, what is politics,Man is by a nature a political animal,page 3,new York,America

رسائل واخبارات

رسائل

شوکت علی،ڈاکٹر انوار احمد کے افسانوی پارے،روزنامہ نوائے وقت،۱۳اپریل ۲۰۰۴ء

فیض احمد فیض(انٹرویو عمران نقوی)،ادبی ایڈیشن،روزنامہ نوائے وقت،لاہور،جنوری ۱۹۸۳ء

اخبارات

قادری،شوکت نعیم،انوار احمد روشن آنکھوں والا کہانی کار،سطور شمارہ ۳،ملتان بیکن بکس،۲۰۰۱ء

محمد سلیم،مدیر،ادب اور احتجاج(سہ ماہی)،ادب سلسلہ،اپریل تاجون ۲۰۱۴ء

ویب سائٹس

25/July /2017 ,6pm http://www.urdulinks.com

12/March/2015 ,8pm http://www.tareekhepakistan.com

13/June/2020 ,12am http://www.khayyalnama.com

11/April/2016,11am http://www.sangatacademy.com